بلونت سنگھ کے افسانے
بلونت سنگھ

بلونت سنگھ کے افسانے

بلونت سنگھ کے افسانے

بلونت سنگھ

مکتبۂ اردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ - لاہور

صفحہ

ماجھا کے علاقہ میں بھکین ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا مشکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی، یہاں کی ایک بات عجیب تھی، وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پر رومان ہوتی کہ سسی پنوں، سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا کے قصے بھی مات ہو جاتے تھے، اور اب کے قرعہ گرنام کور کے نام پڑا تھا۔

گرنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی، وہ ایک گڑیا کی مانند تھی، چینی کی مورت چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقش قدم معدوم، نرگسیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آیا تھا، لیکن وہ ابھی معصوم تھی، شباب کی آمد آمد تھی، اور وہ ایک بے فکر اور پر شباب دوشیزہ کی پر زور حس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی، جیسے خاموش اور پرسکون سمے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جائے، ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی، وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی ابھی اس میں پندار حسن پیدا نہ ہوا تھا، اس لیے جو بھی شخص اس سے بات کر

لیتا یہی سمجھتا کہ گرنام اس سے محبت کرتی ہے، ایک مرتبہ تو شنگار سنگھ نے اعلانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہوکر کہدیا تھا کہ وہ گرنام کو بھگا لے جائے گا، اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گذرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گرنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے، اس نے سن لیا تو حالات خطرناک صورت اختیار کرلیں گے، اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہوکر بکرا بلاّ دیا[1] اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اس نے خشمگین نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا، اور کڑک کر بولا "تو نے بکرا کیوں بلایا ہے"

شنگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلہ پر آن کھڑا ہوا دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں، قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جائیں مگر سب نے بیچ بچاؤ کرا دیا، آخر کہاں تک، ایک ختنی پل پر دونوں کا مقابلہ ہوگیا، دلیپ کا ٹخنہ اتر گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا، جان تو بچ گئی، مگر صورت بگڑ گئی، اس دن سے سب کو کان ہوگئے، اور اب دلیپ کے جیتے جی گرنام کا دعویدار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ چکی تھی، چاند جوبن پر تھا، گاؤں پر ایک پُر اسرار خاموشی طاری تھی کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلا بیٹھا دم ہلا رہا تھا، اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔

"یہ رہٹ اور ڈریوں کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت جس پر ایک جھولا پڑا تھا چونکہ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی

[1] کسی کی تضحیک کرنے کیلئے منہ کے آگے ہاتھ رکھکر بھق بھق کی آواز نکالنا۔

تھا نہیں، جی چاہتا چل دیتے جی چاہتا ٹھہر جاتے، اس وقت خاموشی سے کھڑے ریننگ ہلا رہے تھے،

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آکر رکا اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا سانڈنی بلبلا کر چلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی، پنجاب کے دیہاتوں میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلاف معمولی بات نہیں مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے ہاتھوں اور چہرہ کی رگیں ابھری ہوئی آنکھیں سرخ انگارہ ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ ڈاڑھی کے پاس لٹک رہے تھے کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر بدن پر لانبا کرتا، اور ہونجیا رنگ کا دھاریدار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا، گریبان کا تسمہ کھلا ہوا کسی کی تضحیک کرنے کے لیے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر ہبق ہبق کی آواز نکالتا، اور اس کے سینہ پر کے گھنے بال نمایاں اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھوی،

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے اس نے جوتے اتارے تہبند کو اوپر اٹھایا، اور اپنے موٹے کڑے کو پیچھے ہٹا پانی کی چہال کی طرف بڑھا پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا، اور پھر پانی پینے لگا،

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا، تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا، لڑکی نے پانی بھرنے کے لئے گھڑا چہال کے نیچے کیا، اس کی گودی کلائی

پر کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں۔ جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر کولہے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دلنشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں آدمُو سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا تب وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لیے ہوئے اردڑی پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی، جس پر اپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اپلا نیچے گرا دیا۔ جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر کی ہلکی گلابی رنگت لیے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روندکر چلے آ رہے ہوں لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا، مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا، مرد نے بھاری بھرکم اور کرخت آواز میں پوچھا "تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سُرخ سُرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں مگر مرد غیر معمولی طور پر

بھیانک تھا، مرد نے اسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا "تو کون ہے؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں"۔

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پر آب ہو گئیں، بولی "گمنام"۔

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے بے بے، دیرہ چاچا، باپو سب ہی رہتے ہیں"۔

"مجھے اپنے گھر لے چل" مرد نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے"۔

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں۔ اس نے اپنی دلہن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجہ میں پوچھا "کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو کیا؟"

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا "لیکن مجھے تجھ سے خوف معلوم ہوتا ہے"

"کیوں؟" مرد نے اکھڑ پن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لیے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا "تم ہنستے کیوں نہیں؟"

"ارے یہ بات"، یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا جیسے کوئی پانی سے لبریز مٹکا زمین پر انڈیل دے۔ اس کے قہقہہ کی آواز سن کر چمگادڑیں اپنی

کمیں گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گرنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا اس کی ممٹی تو بہت دور سے نظر آتی تھی ،

دروازہ کے سامنے پہنچ کر اجنبی رک گیا ، اور گرنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا: "واہ گوروجی کا خالصہ سری واہ گوروجی کی فتح !"

"واہ گوروجی کا خالصہ سری واہگوروجی کی فتح !"

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا: "میں دور سے آرہا ہوں، رات زیادہ گزر چکی ہے، میں آج یہیں ٹھہروں گا۔"

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا ، وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی ۔ خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا "میں ہر طرح سے خدمت کے ....

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے اجنبی سانڈنی لڑکے کے سپرد کر، دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان عریبانہ تھا ، مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہ تھیں گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے ، سوائے چار کے

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا ایک بچہ سینہ سے لگی ڈنڈا

لگائے سو رہا تھا، صحن مویشیوں کے موت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا، ایک طرف کھرلی کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی، بھس اور کھل کی سانی کی بو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی، رسی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے ایک طرف خراس دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے ٹکا ہوا چھکڑے کا پہیہ، بڑے بڑے اپلے کونے میں کپاس کی چھڑیاں چولہے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار، ایک کمرہ میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے، ساتھ تلے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن میں سے گزر کر بوڑھا بابو اجنبی کو دروازہ سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی، سوکھے ہوئے اپلے جو جلانے کے کام میں آ سکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے، یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی، چار خانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا،

شلغم کی ترکاری، ایک کٹورے میں شکر گھی، ڈیلوں کا اچار، دو بڑی بڑی پیاز

کی گٹھلیاں، اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اس کو دے آئی،

جب اجنبی نے اونچے سر میں تین چار ڈکاریں لیں، اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے،

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا۔ گرنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا گرنام! بس، جا رہی ہو کیا؟

گرنام حسب معمول اپنے دلفریب طفلانہ انداز سے مسکرائی۔ اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی "سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی"،

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا، شرنیہہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیوؤں کی طرح خاموش کھڑے تھے، لنڈ منڈ بیریوں پر بیّوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے،

ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے، کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کی مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی،

باگے وچ کیلا ای۔
نکل کے مل بالو!
ساڈے ونجھنے دا ویلا ای
نکل کے مل بالو!

اتنے میں گمنام دبے پاؤں، شلوار کے پائنچے اٹھائے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے قریب تھا کہ گمنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گمنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر کار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور تھکان زدہ آواز میں بولی۔

"کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو، میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو، مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔ یہ کہہ کر گمنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی، جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دبانے کو آرہا ہے۔

"مت گھبراؤ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؛ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔

گمنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی۔ تم بہت اچھے ہو۔ یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لیے لائے ہو گے نا؟"

"ہاں"۔

گمنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا تو ہونے والی بیوی کے لیے لائے ہو۔"

اجنبی نے اپنی ڈاڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی، بنے گی بھی یا نہیں۔"

گمنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے، ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا۔"ہاں تم کالے ہو نا ذرا۔"

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

مگر گمنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لیے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

"پھر زیور تم لے لو۔"

گمنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔"پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔"پھر میں تم سے لے لوں گا۔"

گمنام کی آنکھیں چمکنے لگیں، اس کی باچھیں کھل گئیں، تالی بجا کر بولی۔"میں ان کو اپلوں میں چھپا دوں گی۔ کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیورات پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا گرنام تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔"
"کچھ بھی ہو۔"

گرنام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کنڈیلی اور خربوزہ کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

"تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا یہ میری انگلی میں پہنا دو، دیکھوں کیسی لگتی ہے۔"

اجنبی نے اپنے کالے میلے چکیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول سا ہاتھ لیا گرنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا، اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سپید سپید پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا، جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا، تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں۔ اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جا رہی ہے۔

گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی "اماں کھانس رہی ہے اب میں جاتی ہوں"

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گرنام نے آگے جھک کر نقرئی آواز میں پوچھا "جاؤں کیا؟"

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے اجنبی جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھنا لسی کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی اجنبی نے آہستہ سے کہا "روتی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو تم مت جاؤ"

اجنبی ہنس پڑا "میں پھر آؤں گا۔"

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا اس نے اجنبی سے پوچھا "کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرہ پر گاڑ کر جواب دیا پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والے گنڈاسے کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا۔

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا "آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"

جگا ڈاکو اصلی نام سردار جگت سنگھ ڈاک وہ خوفناک شخص تھا کہ جس کا نام
سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے، قتل غارتگری ظلم
لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے
میں ہی گذر گیا بہت سی زمین کا مالک تھا بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا
غریب خوش تھے، اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کر سکتا
تھا۔

تیس برس سے اوپر سن تھا موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا اور موت
کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا تھا محبت، حسن، شفقت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک
کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی، علاقہ بھر اس سے تھراتا
تھا۔

اس کا دل پتھر، بازو آہن غصہ قیامت، ذہن شعلہ ... وہ قہر تھا۔
لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لئے تھے، نوجوان جھوم جھوم کر ان کو
گایا کرتے تھے ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا۔

پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں پکے پل تے،
پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں تے چھویاں دے کل ٹٹ گئے ... جگیاں!
پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا، اور بچ کر واپس بھی
آگیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا۔

جگے ماریا لائل پور ڈاکہ جگے ماریا!
جگے ماریا لائل پور ڈاکہ تے تاراں کھڑک گیاں آپے

اس کی طویل تاریک اور ہیبتناک شب حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کر دیا، اور وہ تارا تھی۔ گرنام!

گرنام بیچاری نادان چھوکری اسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا، اسے لوگ کھنکھیوں سے دیکھتے وہ ہنس دیتی، اس کے جذبۂ پندار حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پہ متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ دانستہ شکار کھیلتے بسملوں کا تڑپنا دیکھے اور اس لذت سے محفوظ ہو جو کہ صیاد دل کے لیے مخصوص ہے وہ بھولی بھالی سادہ رو چھوکری یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہین جس کو زخمی کرنے کے لئے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چھو کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا وہی شاہین اس کے تیر غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا، اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدہ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک متمول زمیندار ظاہر کیا، باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے گرنام کی کشش اسے کھینچ لاتی ہیں اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کیونکر اس کے قابل بنائے اس نے کبھی بھی اس سے محبت جتلانے کی کوشش نہیں کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیونکر اس کا آغاز کرے وہ

سوچتا تھا کہ نا معلوم اس کے اظہار محبت کرنے پر گرنام کیا رویہ اختیار کرلے وہ اس کے پاس آکے بیٹھ جھکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا کبھی کبھی اسس کو خود سے نفرت ہونے لگتی صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی مگر اسس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا گرنام تھی کہ اسس نے کبھی اس سے اظہار نفرت نہ کیا تھا۔ وہ نہایت محبت کے ساتھ اس سے پیش آتی اگر وہ اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی، اگرچہ اس نے آج تک اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی گرنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی اس کا ملکوتی جمال اسس کو سرنگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سُنا کہ

جگے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے ہی گذر گیا۔

جگا صبح و شام پاٹھ کرتا۔ غریبوں کو کھلاتا پلاتا۔ دان کرتا، گوردوارے میں جا کر سیوا کرتا۔ ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

اسس نے بالو کی منت کی کہ گرنام کور کی شادی اسس کے ساتھ کر دی جائے اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ سب بڑی توند والوں کا تھا غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کو تیار تھا اور بالو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس

کی خدمت کریگا لیکن گرنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا۔ اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریتم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی، تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی

نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگا بھیکن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا، مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ اول تو آتا ہی کبھی کبھار تھا۔ اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگے کو دنیا جانتی تھی۔ مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

جگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی عشق کا اقرار کروالے، خواہ اسے یہ نہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دن بعد از غروب آفتاب وہ بھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سوت دینے کے لیے گئی ہوئی تھی۔

جگے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا اونچا کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا۔ اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود داڑھی

پر خوب اچھی طرح بل لیا، پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا، پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔

ہر طرف دھند سی چھائی ہوئی تھی، چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی پڑتا تھا۔

دور سے ایک صورت دکھائی دی، اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کوئی عورت تھی۔ اور یقیناً وہ تھی بھی گرنام

جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

گرنام قریب آتے ہی مسکرا دی، لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی۔ "میری تو گردن ٹوٹ گئی۔"

"اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا، جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ سے پکڑ کر اٹھا لے۔

"اپلے، اور ہوتا کیا؟" گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ "آ رہی تھی رستہ میں اپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی۔"

دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج جگے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کیے دیتا تھا، کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔

آخر کار اس سے رہا نہ گیا گرنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی مگر نام!" یہ کہتے کہتے رال
اس کی داڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا۔
"گرنام! تم کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔"

گرنام نے کچھ جواب نہ دیا وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں
مصروف تھی، اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلی سی شوخ اور الھڑ نہ رہی
تھی، مگر چونکہ جگے سے کافی مانوس تھی، اس لیے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں
تھی۔

جگے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا،
"کیوں گرنام کس سوچ میں ہو؟"

گرنام پہلے تو چونکی پھر اس نے دھیرے سے کہا، "میں بہت پریشان ہوں
میں بہت دن سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں لیکن ....."

"لیکن کیا؟"

"شرم آتی تھی" گرنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

جگا کچھ کچھ تاڑ گیا" زیرِ مونچھ" مسکرایا" ارے مجھ سے شرم کیا؟" گرنام
چپ رہی۔

جگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا اس کے بار بار اصرار کرنے پر گرنام نے
بتایا" وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، شادی تو سبھی کی ہوتی ہے"

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آگئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی" وہ کسی روپیہ

بسینہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں
مگر میں اور کسی سے ...‘‘
یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔
جگے نے اپنے اوپر کی طرف اُٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے
تو نہیں جھک گیا پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا نہیں گرنام ۔نہیں جس کو تم چاہو
گی اسی سے تمہاری شادی ہو گی میں باپو کو خود سمجھا دوں گا .... ہاں تو ... مگر
وہ ہے کون؟‘‘
جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھی،
گرنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی آج
اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر تسکین حاصل
ہو رہی تھی،
جگا گھبرا گیا، اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام
پوچھا گرنام نے کچھ کہنا چاہا پھر رک گئی .... اور زور زور سے رونے لگی جگے نے
تسکین دی تو وہ بولی تم ضرور میری مدد کرو گے۔ ان سب کے ہاتھوں سے سخت
بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام ...‘‘
جگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا،
’اس کا نام ہے دلیپ ... دلیپ سنگھ‘
جگے کو سانپ نے ڈس لیا۔
اس کا چہرہ یکایک بھیانک ہو گیا۔

"دلیپ سنگھ اس کا نام ہے" گرنام نے دہرایا۔

جگے کی مونچھیں پھڑکنے لگیں،

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے، جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے، آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں گردن کی رگیں پھول گئیں، گرنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھر جاؤ" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

گرنام متانت سے بولی:

تم فوراً واپس چلی جاؤ، اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا گرنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چلدی جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا، عقاب کی چونچ نما ناک سرخ ہو گئی آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں اور چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی، "اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا۔ دلیپ سنگھ"

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی تھی اور نہ ہی چاند کی چاندنی پُل بڑے بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا اس کے نیچے

صرف ایک کوٹھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا، رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو انسانوں کو ہڑپ کر لینے کے لیے منہ کھولے بیٹھا ہو یا جیسے کسی مردے کی دو بڑی بڑی آنکھوں کی پتلیاں کوے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا۔ اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ رات کے وقت کوئی شخص ادھر سے گذرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس پل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی، خونی پل رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے ادھر نہ آتے تھے، مشہور تھا کہ وہاں ایک سرکٹا سید رہتا تھا، کبھی کبھی اس کا سر تو پل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود بلا سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گذر چکی تھی۔

دلیپ سنگھ شہر سے واپس آرہا تھا چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا وہ سنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی اس کی اپنی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا خوش رُو خوش وضع مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں۔ گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران آنکھیں شربت سے لبریز کٹورے سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا الغوزے خوب بجاتا تھا۔

جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہے تو اس واقعہ کو وارث کی ہیر سے بڑی دردناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

طاقتور اور دلیر نوجوان تھا مگر خونی پل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی۔ اس نے ذرا بلند آواز میں "چھلی" گانا شروع کر دیا تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سن کر اس کو تسکین ہوئی۔

اس کا گدھا پل پر سے پار ہو چکا تھا وہ عین پل کے درمیان میں تھا دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا معاً پیچھے سے اسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کرتے کو پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو، اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد پل کی دیوار پر سے اچکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھری پیچھے سے اس کی قمیض میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں "تم کون ہو؟" دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔"

"ادھر آ" بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔"

دلیپ اس کی طرف بڑھا یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا اور بولا مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ میں نے تجھ کو کہیں دیکھا ضرور ہے کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا۔۔۔۔۔ ہاں شاید

وہ شکانہ صاحب کا میلہ تھا ۔ تبھی کا واقعہ ہے ۔ ۔ ۔ اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے ۔

" بے شک میں وہی ہوں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ تھا ، میں تجھے ایک اجنبی اور نو عمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا اور قتل تو میں نے بہت کئے ہیں اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ اور آج مجھ کو بارہواں قتل کرنا ہے ،

دلیپ کو اس کے اجڈ پن پر تعجب ہوا بولا " میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے تم تو میرے محسن ہو ۔

" تو گرنام سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے مجھ کو یہ بھی معلوم ہو لیے کہ تو نے شنگارا سنگھ کو اس پل پر سخت زخمی کیا تھا ، آج تیرا میرا فیصلہ ہو گا ۔

یہ کہہ کر اجنبی نے چھری ہاتھ سے رکھدی اور اس کی طرف بڑھا ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آ جائے ۔"

دلیپ لپس وپیش کر رہا تھا ، اس نے کہا میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا ۔"

اجنبی نے گرج کر جواب دیا " تو بزدل ہے یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے ۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ ۔"

یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا

دلیپ کو غیرت آ گئی ، وہ شیر کی طرح بپھر گیا ، وہ ڈنڈا جو وہ گدھے کو ہانکنے

کے لیے ہاتھ میں لئے تھا اس نے اس کے منہ پر دے مارا لیکن اجنبی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی ڈنڈا ٹوٹ گیا اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا، دلیپ جوش میں تھا، اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکا اس کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا۔۔۔ مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی ڈاڑھی کو تر کر رہا تھا ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا۔ اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی۔

مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا: اس طرح نہیں، دلیپ! تم ابھی محض بچے ہو۔ لیکن جگا کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا اپنی اصلی جگہ پر آ گیا۔ دلیپ جگے کا نام سن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوری پکڑ کر بولا "تیرے پاس چھوری ہے؟"

"نہیں"

"تلوار ہے؟"

"نہیں"

"صفات جنگ؟"

"نہیں"

"مگر لاٹھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی۔"

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جا" اجنبی نے پکار کر کہا "لاٹھی لے آ، میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری عزت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔ جگے نے چھوی اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھالی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی للکار کی آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑپھڑانے لگے گیدڑوں نے ہوا ہوا ہو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نو آموز اور نوجوان پھر کرا بجلی کی طرح بے چینی جوڑ جوڑ میں پارہ جگا بھاری بھرکم قوی ہیکل کہنہ مشق دلیو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر ٹھیکری پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلایا "ایک"

دلیپ نے تیسرا وار کیا جگا اسے بچا کر گرجا۔ "دو"

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگے نے اسے بھی روکا اور کڑکا "تین"۔ یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا "او سنبھل لے چھوکرے اب جگا وار کرتا ہے"۔

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً لڑکھڑاتا ہوا پُل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی اس نے ایک وحشی بھیڑیے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی، اور پھر دونوں ایڑیوں کو اٹھا آگے کی طرف اچک کر اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے پھرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی۔ مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی سر پھٹ گیا، اور وہ تڑپ کر بابہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارہ پر جا گرا۔۔۔ کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خونی پل قہقہے لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہو، بکیاں بیتی ہوئی چل رہی تھی،

زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی کو صاف کیا منہ ہاتھ دھویا کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی۔ اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ

کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی، پھر اس نے چھوی اٹھائی اور دلیپ کو بیٹھ پر
لاد کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا ۔

اس واقعہ کے پچیس دن بعد!

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہوجاتی ہے خصوصاً سردیوں میں تو لوگ
فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں ۔

گمنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پاکر بڑے کمرے
میں بیٹھے تھے ، عورتیں چرخہ کات رہی تھیں ، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے
اور بچے شرارتوں میں مصروف

اتنے میں تیگا اندر داخل ہوا ۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھوں میں چھوی چمک
رہی تھی سب نے اس کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا ۔

گمنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی ۔ سب نے اسے بیٹھنے کے
لیے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی باہر کھڑی تھی اور اسے جلد ہی واپس
جانا تھا

چند لمحوں کے لیے اس نے سکوت کیا پھر اس نے نہایت مختصر اور فیصلہ
کن انداز سے کہنا شروع کیا ' میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لیے
آیا ہوں کہ آپ گمنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو
سکتی بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہ میں چاہوں گا ۔

سب لوگ حیران تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گمنام کا ہونیوالا خاوند وہ

خود ہی تھا مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی، اس لیے وہ خاموش رہے۔

.....، اور وہ شخص یہ ہے" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا اور دلیپ اندر داخل ہوا،

ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہوگئی۔

گرنام نامعلوم کس دنیا میں پہنچ گئی اس کو شرما جانا چاہیے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

جگے نے دلیپ سنگھ کے کان میں کہا، "اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو میں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا مگر برسوں سے مجھ کو محبت ہے۔ اب جب کہ تمہاری گرنام تمہارے سپرد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے۔"

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا،

جگا بلند آواز میں بولا، "باپو، اماں!! بے بے!!!" "میں ان کی شادی کے لیے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا، اور ان کو بہت سی زمین دوں گا۔!!

باپو اصل قصہ بھانپ گیا لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا، کہ دلیپ زندہ کیونکر ہو گیا، مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پل پر قتل کر دیا تھا، دلیپ نے قصہ گھبرا کر سنادیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا تھا، اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا، اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھ قتل ہو جاتا کہ سردار

دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر تندی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور ان کو بھاگتے ہی بنی پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمار داری کرتے رہے۔

جگے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی اس نے جگے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا پہلے اس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی تم کتنے اچھے ہو.... تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو۔

قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے۔ مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کیلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی کہ دور سے غبار سا اٹھا کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے ان کی سجی سجائی سانڈنیاں، مردانہ اور دیو پیکر صورتیں، چمکتی ہوئی چھریاں، عجب منظر پیش کرتی تھیں۔ ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی باپو! وہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے۔

نہیں بیٹی نہیں، وہ دھرم سنگھ نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینہ سے لگا لیا۔ اور پھر ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں

کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا" آج جگا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لیے جا رہا ہے۔

کٹھن ڈگریا

ڈکلی چند دکان سے واپس آرہا تھا، صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس
وقت کوئی مزے دار بات سوچ رہا ہے، ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی چلتے
چلتے جب اُسے سگریٹ سلگانے کی خواہش محسوس ہوئی تو اسے خیال آیا کہ ماچس
تو دکان ہی پر رہ گئی ہے خیر کوئی مضائقہ نہیں اب وہ گھر کے قریب پہنچ چکا ہے،
وہ اپنی دھن میں اس قدر مگن تھا کہ اسے سگریٹ منہ سے نکالنے کا خیال تک نہ آیا کسی
رہ گیر کی نظر اس کے ڈھیلے ڈھالے ہونٹوں میں پھنسے ہوئے سگریٹ پر جا پڑتی تو
وہ بے اختیار مسکرا دیتا، اس پر طرہ یہ کہ وہ خود بخود مسکرائے جا رہا تھا، کبھی سر کو حرکت
دینے لگتا کبھی زیر لب کچھ کہنے لگتا، وہ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا لیکن وہ
پاگل نہیں تھا چونتیس پینتیس برس کے قریب عمر، صورت بھی بری نہیں تھی صحت کافی
اچھی تھی تین بچوں کا باپ تھا، گیارہ بجے دکان پر جاتا، اس کا معاون پہلے ہی سے موجود
ہوتا تھا، ایک سے دو بجے تک لنچ کیلئے دکان بند کر دی جاتی، شام کے پانچ بجے کے
قریب وہ گھر چلا آتا، البتہ دکان سات بجے تک کھلی رہتی، آج کاروبار کے سلسلے میں ایک
شخص کو ملنے کے لیے اسے دہلی جانا تھا، اس نے اپنی بیوی شانتا کو سامان تیار کرنے
کے لیے بھی کہہ دیا تھا، لیکن اچانک دکان پر اُسے تار ملا کہ کل وہ شخص خود لاہور پہنچ رہا

ہے۔ چلو سفر کی مصیبت سے جان چھوٹی لیکن آج شام کا پروگرام کیا ہو؟ یہ سوال خواہ مخواہ اس کے ذہن پہ اُبھر آیا اور وہ چند لمحوں کے سبب اس فکر میں غلطاں رہا اور پھر دل کی پکار خود بخود واضح ہو گئی کہ یہ شام اپنے دوست نیچ ناتھ کے ہاں گزاری جائے بلکہ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا جائے۔

کچھ روز سے نیچ ناتھ کی بیوی کامنی اُس کے لیے خاص کشش کا باعث بنی ہوئی تھی۔ یہ بات اخلاق سے گری ہوئی ضرور تھی لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ جوانی کے زمانے میں وہ حد سے زیادہ مشرمیلا بنا رہا۔ زندگی کا سنہرا زمانہ کسی سے محبت کی پینگیں بڑھائے بغیر گزر گیا۔ جب شادی ہوئی تو چند سال تک وہ بیوی کا دیوانہ بنا رہا۔ مگر رفتہ رفتہ بیوی میں کوئی کشش باقی نہ رہی۔ جب کبھی بیوی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی تو بس ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی۔ وہاں انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ اپنی بیوی بے رس معلوم ہونے لگی۔ اور اس نے بازارِ حُسن کا رخ کیا۔ وہاں دلال یہی کہتا کہ بس صاحب ہفتے بھر ہی سے بازار میں بیٹھنے لگی ہے۔ پہلے پہل تو یہ خیال ہی کچھ کم لذت انگیز نہیں تھا۔ لیکن جب دلالوں کے ہتھکنڈوں کا علم ہوا تو طبیعت بجھ گئی۔ دنیا کا دھندا تو چلتا رہا لیکن محبت کی پیاس کے مارے دل میں ہر دم کانٹا سا کھٹکنے لگا۔

گزشتہ دنوں اتوار کے روز وہ اپنے مکان کے سامنے چبوترے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس نے نیچ ناتھ کو کامنی کے ہمراہ اپنے قریب آتے دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہونے پر نیچ ناتھ نے کہا۔ "ہم اجنبی ہیں، مکان تلاش کر رہے ہیں۔ کیا آپ ہماری مدد کر سکیں گے؟"

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے مکان دلوا دیا۔

اگرچہ ان کے مکانوں کے درمیان میل بھر سے کم فاصلہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود دونوں گھرانوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے، ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا، دکھ سکھ میں شرکت کرنا، کبھی کبھا تفریح کی غرض سے شہر سے باہر چلے جانا ان کے معمول میں داخل ہو گیا تھا۔

ایسے موقعوں پر کامنی اس کی طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لیتی، پہلی مرتبہ تو اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سمجھا کہ اس کی نگاہوں نے دھوکا کھایا ہے، لیکن پھر جب دبی دبی مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا، تو اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ ایک دوسرے سے محبت کر سکیں گے۔ کبھی کبھی اس کا دل لعن طعن کرتا، لیکن پھر وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر ڈھارس دے لیتا کہ کامنی ہی کی طرف سے تو آغاز ہوا ہے۔ کبھی سوچتا، معمولی دل لگی ہی تو ہے۔ ذرا کی ذرا چہل ہو جاتی ہے، دل بہلا رہتا ہے۔ اس میں قباحت کی تو کوئی بات ہی نہیں، لیکن یہ سب ظاہرداریاں تھیں کیونکہ دل کی گہرائیوں میں وہ اچھی طرح محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے کامنی سے محبت ہو گئی ہے۔

راستہ چلتے چلتے وہ کامنی کی بابت سوچتا رہا۔ ابھی تک اس نے اسے چھوا تک نہیں تھا۔ شاید آج کوئی اہم واقعہ پیش آئے، ممکن ہے کہ وہ اس پہلی محبوبہ کے بہت قریب پہنچ جائے۔ اب وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ جیا پنواڑی کی دکان اس کے مکان کے قریب ہی تھی۔ دکان کے قریب سے ہو کر گزرتے وقت سلگتی رسی دیکھ کر اسے سگریٹ سلگانے کا خیال آیا۔ اگر کوئی دوست اسے ملنے کے لیے آتا تو گھر والوں کو خبر ہو یا نہ ہو لیکن جیا ضرور اس بات کا خیال رکھتا تھا۔ چنانچہ سگریٹ سلگا کر اس نے جیا سے پوچھا۔ "کیوں بے جیے! مجھے کوئی شخص ملنے کے لیے

تو نہیں آیا تھا۔

اس وقت جیا نسوار سونگھ رہا تھا۔ چھینک آنے ہی کو تھی، اس لیے منہ سے جواب نہ دے سکا۔ کبھی اثبات میں سر ہلاتا، کبھی نفی میں، آخر معلوم ہوا کہ کوئی شخص نہیں آیا تھا۔

رکھی نے سگریٹ کا کش کھینچا اور گھر کی طرف بڑھا۔ دروازے کے آگے جو تین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں، ان کی دو اینٹیں اکھڑ گئی تھیں ہر دم ان پر سے پھسلنے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اسے کئی مرتبہ خیال آیا کہ ان کی مرمت کروا دی جائے، لیکن لاپروائی میں یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

گھر کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ شانتا بڑے آئینے کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی ہے۔ معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی نہا کر آئی ہے، اس وقت خاصی پیاری دکھائی دے رہی تھی، اس کے دوست کہا کرتے "تمہاری عورت تو بہت حسین ہے۔ پھر بازاروں میں اِدھر اُدھر دھکے کیوں کھاتے پھرتے ہو؟"

شانتا نے بال ایک ہاتھ سے گھما کر آگے لاتے اور ان پر کنگھی کرتے ہوئے کہا جی میں نے آپ کا سامان تیار کر دیا ہے۔

"بھئی آج تو میں نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟" شانتا نے تعجب سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

"جس شخص سے ملنا تھا، وہ خود کل یہاں آ رہا ہے۔ نل بند تو نہیں ہوا؛ ذرا نہا لوں"

وہ غسل خانے میں چلا گیا اور وہاں دو کا کردوں تو سے الفت ہو گئی ۔۔۔۔ ہو گئی" گاتا رہا۔ جب کپڑے پہن چکا تو بیوی نے پوچھا "اب کھانا کھا کر ہی باہر جائیے گا۔"

"نہیں بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ایک شخص سے ملنا ہے۔ کھانا باہر ہی کھاؤں گا۔"

انتظار میں مت بیٹھی رہنا۔

حالانکہ اس کی بیوی کو اس پر کسی قسم کا شک نہیں تھا لیکن اس نے زیج ناتھ کے گھر کا نام جان بوجھ کر نہیں لیا۔ آخر کیا فائدہ، عورتیں وہمی تو ہوتی ہی ہیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے اس نے اپنی صورت کا جائزہ لیا۔ اور اس نے خود ہی فیصلہ کیا کہ اس کی صورت زیج ناتھ سے کہیں بہتر ہے اور اگر کامتی اسے اپنے شوہر پر ترجیح دیتی ہے تو اسے اس کی خوش ذوقی کا ثبوت سمجھنا چاہیے۔

خوب بن سنور کر اس نے اپنے آپ پر آخری نگاہ ڈالی۔ کوٹ کی اوپر والی جیب میں رنگین رومال ٹھونکنے سے رکھا، رخساروں پر ہاتھ پھیر کر ان کی ہمواری کا جائزہ لیا ٹائی کی گرہ درست کی۔ پتلون کی کریز پہلو بدل بدل کر دیکھی۔ ہیٹ پر جمی ہوئی گرد کی باریک تہہ چٹکی بجا بجا کر صاف کی چاندی کا سگریٹ کیس جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے ایک نظر بیوی کی طرف دیکھا۔ آج ہی واقعی حسین دکھائی دے رہی تھی، دونوں لڑکے نانا کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بیوی کو پیار کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی، لیکن وہ جلدی میں تھا۔ اس لیے چھڑی گھماتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ اگر وہ سگریٹ کیس میں عبداللہ کے سگریٹ رکھ لیتا تو بہتر ہوتا۔ وہ عبداللہ سگریٹوں کا بڑا مداح تھا اور انہیں خصوصاً اس وقت پیتا تھا، جب وہ خوش ہو۔ اب سگریٹ لینے کے لیے واپس جانے میں اس نے بدشگونی سمجھی۔ اس لیے کھڑے بازار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اس کا دل مسرور تھا، قدم بڑے بانکپن سے اٹھ رہے تھے۔ ارد گرد کی چیزیں اجلی اور نئی نئی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے ہر چیز نے نیا جنم لیا ہو اس میں چمک تھی اور حرکات سے چلبلا پن عیاں تھا۔ اپنی بیوی اور گھر سے دور وہ اپنے آپ کو آزاد

پرندے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا، وہ کالج کے اس چھوکرے کے مانند دکھائی

دے رہا تھا، جو گھر سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہو اور اب والدین کے روپے سے

عشق لڑا رہا ہو۔ محض عورت کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی وہ تو محبت کا بھوکا

تھا، درد عشق کا خواہاں تھا، اصل چیز تو وہ جذبۂ یگانگی تھا، جو وہ کمو کے لیے محسوس کر رہا تھا،

وہ دل ہی دل میں کامنی کو پیار سے کمو کہا کرتا تھا، اس کی یہی ایک تمنا تھی کہ اگر ان کی

محبت پروان چڑھے اور دونوں کے دھڑکتے ہوئے سینے کسی روز مل جائیں تو وہ

اُسے پیاری کمو کہہ کر بلائے، کبھی کبھی جب وہ تصورات کے طلسم سے نکلتا تو سوچتا

کیا معلوم اس کے نصیب میں حسین کامنی کی محض مسکراہٹ ہی لکھی ہو؟

آخر شام کے دھندلکے میں جب بیج ناتھ کا بلا پلستر کی اینٹوں کا بنا ہوا مکان نظر

آنے لگا، تو اس کے قدم ڈگمگانے لگے، یہاں تک تو وہ ایک مبہم لیکن مسحور کن جذبے

کے ماتحت چلا آیا تھا لیکن اب وہ سوچنے لگا کہ اسے ان کے گھر میں کس انداز سے داخل

ہونا چاہیے، اس مسئلے کے کئی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ان

معاملات پر زیادہ تجویزیں سوچنے کی ضرورت نہیں، ہر حرکت بے تکلفانہ ہونی چاہیے،

چنانچہ وہ بڑی بے تکلفی سے اُن کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

بڑے کمرے سے میاں بیوی کے ہنستے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی

دے رہی تھیں رکھی دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ بیج ناتھ پاؤں پھیلائے کرسی کے

بازو پر بیٹھا تھا، اُس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاید

وہ باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا، کامنی اس کی قمیص میں بٹن ٹانک رہی تھی، اور وہ

گا رہا تھا، بیوی بگڑ رہی تھی: اب ذرا گانا بند کر دیجیے نا، سوئی چبھ جاتی ہے اور جلنے

گی، تو پھر نہ کہیے گا۔

شوہر مسخرے پن سے بولا "تم سے نہیں کہیں گے تو اور کس سے کہیں گے مائی ڈارلنگ اور ہمارا کون ہے۔" اور پھر وہ نہایت بھونڈے انداز میں نتھنے پھلا پھلا کر شکستہ بانس کی سی آواز میں ایک فرسودہ سا فلمی گانا گانے لگا۔

"تیرا کون ہے،
کسے کرتا تو پیار پیار پیار
تیرا کون ہے۔۔۔ تیرا کون ہے۔۔۔ ہاں تیرا کون ہے۔"

ادھر میاں بیوی میں یہ چہلیں ہو رہی تھیں، ادھر چھ ماہ کا بچہ پالنے میں پڑا رو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیج ناتھ اس وقت بڑے خوش گوار موڈ میں تھا، جوں جوں بیوی اس کی حرکات سے چڑتی توں توں وہ اسے اور زیادہ پریشان کیے جاتا وہ جھنجھلا کر کہتی "اب منکنا بند کیجیے، منا رو رہا ہے۔"

دکھی رام دو قدم آگے بڑھا اور اس نے کھانس کر انہیں اپنی آمد سے مطلع کر دیا۔ بیج ناتھ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، پہلے تو حیران رہ گیا، پھر چلایا "ہلو ہلو! یار! میرا خیال تھا، اب تک تم گاڑی میں بیٹھے ہو گے۔"

دکھی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا "نہیں بھئی۔ دلی جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا ہے۔ کرپا رام سے ملنا تھا، اس کا تار آیا ہے کہ کل وہ خود لاہور پہنچ رہا ہے۔"

اتنے میں کامنی نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کر دی "جی نمستے!" اس نے بڑی معصومیت اور اخلاق سے جواب دیا۔

منا رو رہا تھا، کامنی اسے پیار سے پالنے میں سے اٹھا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی، منا کیوں رو رہا ہے؟ ہمارا منا کیوں رو رہا ہے؟ نا، نا،... کیوں جی آپ کی منی بھی رو رہی تھی؟

"جی نہیں" رکھی نے جواب دیا: "ہماری منی تو سوئی پڑی تھی۔ آج کل ہمارے گھر میں بچوں کا شور بہت کم ہوتا ہے۔ گوشی اور جبیہ دونوں نانا کے ہاں گئے ہوئے تھے بچے ہیں نا، نئی جگہ ان کا دل بھی بہلا ہوا ہے۔ گھر میں بیچاری منی ہے سو چپ چاپ پڑی رہتی ہے"۔

"نا جی نا، ہمارا منا بھی تو نہیں روتا" کامنی نے بچے کو پچکارتے ہوئے کہا: "آج تو اس کے بابو جی نے اسے رلا رلا کر ہلکان کر دیا ہے میں ان کے بٹن ٹانک رہی تھی اور یہ ہل ہل کر گاتے جاتے تھے، منا جاگ اٹھا اور رونے لگا"۔

جب وہ باتیں کر رہی تھی تو رکھی اسکے لچکیلے جسم اور تیزی سے ہلتے ہوئے ہونٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت سج دھج کا تو کوئی سوال نہیں تھا۔ لیکن معمولی گھریلو لباس میں بھی وہ کس قدر حسین دکھائی دے رہی تھی، اور پھر دفعتہً جیسے اسے کچھ خیال آیا تو تیج ناتھ سے مخاطب ہو کر بولا "یار معلوم ہوتا ہے کہ تم باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے، میں تو یوں ہی ادھر چلا آیا۔ اگر تم کسی کام سے جا رہے تھے تو چلو"۔

"نہیں یار بیٹھو، باتیں کریں"۔

"نہیں بھئی مجھ سے یہ نہ ہوگا"۔

کامنی نے بچے کو گود میں جھلاتے ہوئے کہا: "آج ان کی دعوت ہے کہیں"۔

"واقعی، بھئی واہ۔ اب تو میں تمہارا راستہ نہیں روکنا چاہتا ضرور جاؤ۔ تکلف کی ضرورت

ہی کیلئے ؟"

"نہیں اب میں نہیں جاؤں گا تم اتنی دور سے آئے ہو اب تو مل کر باتیں کریں گے اور ہاں جیلانی کے ہاں برج کھیلنے کیوں نہ چلیں ؟"

لیکن رکھی کو اپنی حرکت بہت نامناسب معلوم ہو رہی تھی " نیج بھائی اپنا پروگرام خراب مت کرو۔ میں تو یوں ہی پلا آیا تھا، بس اب سیر کرتے ہوئے گھر جاؤں گا۔ یہ ذرا بدتمیزی کی بات ہے کہ میری وجہ سے تمہارا میزبان پریشان ہو اور پھر ہم دونوں میں تکلف بھی تو نہیں ہونا چاہیئے۔"

نیج ناتھ چند لمحوں تک چپ رہا، پھر بولا " اتنی دور سے آئے ہو۔ ہم دونوں کا وقت خوب کٹ سکتا ہے ہاں یار ایک اور بات سوجھی ہے مجھے تم یہیں بیٹھو اور میں ذرا کھانا کھا کر زیادہ ایک گھنٹے کے اندر واپس آجاؤں گا۔ میری واپسی تک تم کھانا بھی یہیں کھا لو گے اور پھر ہم جیلانی کے ہاں چلیں گے، بڑا مزے کا شخص ہے گپ بھی اڑے گی اور برج بھی کھیلے گی۔"

رکھی کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آرہا ایک گھنٹے تک یہ وہ اور کامنی تنہا رہ جائیں گے گوری کا منا تو سو ہی جائے گا، اس سے بڑا چار سالہ لڑکا بھی سلایا جا سکے گا، اس نے تیزی سے اٹھتی ہوئی نگاہ کامنی پر ڈالی گوناگوں جذبات کے ہجوم میں وہ کچھ نہ بول سکا۔ نیج ناتھ کہتا چلا گیا " کہو یار کیسی رہی ، بھئی کہیں جانا نہیں ، تمہیں میرے سر کی قسم ! میں بہت دور نہیں جا رہا ہوں۔ یہی اپنے ڈاکٹر شرما ہی کے ہاں تو دعوت ہے تم شاید نہیں جانتے انہیں، تمہارے راستے ہی میں تو مکان پڑتا ہے اچھا تو وعدہ کرو تم نہیں جاؤ گے یہ نہ ہو کہ میں بھاگم بھاگ واپس پہنچوں اور تم غائب ہو جاؤ بس آج شاندار پروگرام رہے گا۔"

رکھی چپ چاپ کھڑا رہا. بھلا کیا کہا جا سکتا تھا، اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ تقدیر بھی اس قدر اچھی ہو سکتی ہے. وہ ایک موہوم سی اُمید پہ یہاں آیا تھا، ادھر بھگوان نے بھگت کی پرارتھنا قبول کر کے خود اپنے ہاتھ سے اس کے راستے کا کانٹا صاف کر دیا...

"لو یہ رہے سگریٹ اور یہ ماچس، رکھو! انھیں روٹی کھلا دینا، ذرا خیال رکھنا، بھاگ نہ جائیں کہیں. میں چٹکی بجاتے میں آیا."

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی پتلون کے بٹن لگانے لگا. برش سے بال ہموار کیے، ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے اگلا پلو نیچے اوپر کیا. پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر والے دروازے کی طرف بڑھا. کامنی پکار کر بولی. "ائے کیسے بھاگے جا رہے ہیں. گھر سے باہر جانا ہو تو پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں. اب جلدی لوٹ آیئے گا."

"ہاں بھئی لوٹ آؤں گا. لوگ ہمارا اینڈھن اٹھا اٹھا کرلے جاتے ہیں. اس کی فکر کیا کرو. ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لو. اچھا یار میں چلا."

ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے کامنی بیٹھک کی کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی. ایک مرتبہ پھر شوہر سے آنکھیں چار ہوئیں شوہر نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے ہلا دیا. وہ وہاں چپ چاپ کھڑی اسے گلی کے نکڑ سے غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہی. اس اثنا میں رکھی بھی چپکے سے دیوار سے لگ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا. کچھ دیر تک کامنی سنسان گلی کی جانب دیکھتی رہی پھر اس کا ہاتھ اوپر اٹھ کر بجلی کے بٹن کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحے میں بجلی کا بلب بجھ گیا اور فرش پر بچھی ہوئی دری پر کھڑکی میں سے آتی ہوئی چاندنی پھیل گئی.

رکمی نے بازو بڑھایا جو کامنی کے پیٹ سے ہٹتا ہوا اس کے گوشت سے بھرپور کولھے پر جا کر ٹک گیا۔ کامنی کی کمر ہلکی سی لرزش کے بعد ساکن ہو گئی، وہ اور قریب ہو کر اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار نہیں ہوئیں لیکن کامنی کی کمر نے ایک لرزش کے بعد سکون اختیار کر کے گویا اس کے سوال کا جواب اثبات میں دے دیا تھا۔

وہ خاموش کھڑے تھے، دو ایک مرتبہ رکمی کے لبوں سے نکلتی ہوئی دردِ محبت میں ڈوبی ہوئی نہایت مدھم سی آواز سنائی دی۔ کمو کمو!

"بی بی جی! بی، بی، جی! بڑے لڑکے کی پکار سنائی دی۔

وہ بلند آواز میں بولی۔ "آئی بیٹا! آئی، بیٹھے رہو وہیں"۔ رکمی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ ذرا پرے سرک گئی۔ "سنو کمو سنو! اس کی آواز بری طرح لرز رہی تھی۔

کامنی دو قدم پرے دیوار سے پیٹھ لگائے دونوں ہتھیلیاں دیوار پہ ٹکائے سر نیہوڑائے کھڑی تھی۔ کمرے کی فضا خواب ناک تھی ہر طرف سرمئی غبار سا چھایا ہوا تھا۔ کامنی کی مدھم شبیہ حسین مجسمے کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کی چھاتیوں کے زیر و بم سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بے جان مورت نہیں ہے۔ کمو! سنو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

میں تم سے محبت کرتا ہوں کیسے فرسودہ الفاظ تھے جنہیں اس نے بیسیوں مرتبہ کتابوں میں پڑھا تھا، فلم کے پردے پر سنا تھا لیکن آج وہ یہ فقرہ اس طرح ادا کر رہا تھا، جیسے یہ اسی کی اختراع ہو۔

جواب میں کامنی نے پلکیں اوپر اٹھائیں اور ایک مرتبہ بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سپردگی کے انداز میں پلکیں جھکا کر رہ گئی۔ وہ بجلی کے

کوندے کی طرح آگے بڑھا اس کی کمر بانہوں میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے پھولوں کی نازک ڈالی پکڑ کے جھنجھنا دی ہو اس کا جسم سر سے پاؤں تک کامنی کے نرم اور لچکیلے جسم کے لمس سے محظوظ ہونے لگا۔ ایک شدید اور فوری جذبے کے تحت اس نے نہ معلوم کس کس طرح اسے بھینچا چوما اور پھر لڑکے کی پکار کی آوازیں ہتھوڑوں کے دھمکوں کی طرح سنائی دینے لگیں اور پھر کامنی اڑتی ہوئی خوشبو کی طرح اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ کمرے میں تن تنہا کھڑا رہ گیا کھڑکیوں میں داخل ہوتے والی چاند کی روشنی میں کرسیاں، تپائیاں، تصویریں، پردے اور کتابیں، غرض ہر شے خواب ناک اور ساکن، دکھائی دے رہی تھی، صرف اس کی ٹانگیں اور بازو لرزاں تھے، سانس تیزی سے چل رہی تھی، غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے چند غیر مبہم سی آوازیں نکل گئیں، کچھ دیر تک وہ خلا میں گھور گھور کر دیکھتا رہا، ایک مرتبہ احساس گناہ کی شدت سے کانپ بھی اٹھا لیکن صرف ایک لمحے کے لیے پھر اس نے رومال سے منہ اور پیشانی صاف کی، کپڑوں کی سلوٹیں اور کوٹ کی بھول کھائی ہوئی آستینیں کھینچ کر ہموار کیں، پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا صحن میں باورچی خانے کی جانب بڑھا، کامنی چولہے کے قریب بیٹھی دیگچی میں چمچ چلا رہی تھی، اس کا ٹارلڈ کا اس کے گھٹنے کے ساتھ لگا ہوا اونگھ رہا تھا، وہ چولہے میں لپلپاتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں کامنی کے دمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا رہا باہمی کشمکش میں کامنی کے بال پریشان ہو گئے تھے، گال سرخ ہو گئے تھے، قمیض دو تین مقامات سے مسک گئی تھی، یہ سب اسی کی دست درازیوں کے نتائج تھے، اس خیال سے وہ ایک نئی لذت کے احساس میں گم ہو گیا۔

بظاہر کامنی اُس کی آمد سے بے خبر دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہی بچے کو اونگھتا ہوا دیکھ کر اُس نے کہا۔ چلو تمہیں سلا دوں اور اسے سلانے کے لیے اندر چلی گئی۔

رکھی چولھے کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں حالات کا جائزہ لینے لگا۔ کامنی پھر چولھے کے قریب آ بیٹھی۔ اس کی حرکات سے کسی غیر معمولی واقعے کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ دیگچی چولھے سے اتار کر اُس نے توا رکھ دیا اور آٹا توڑ کر پیڑا بنانے لگی اور اس سے آنکھیں ملائے بغیر بولی آپ کو سردی لگ رہی ہوگی۔۔۔ چولھے کے قریب آجائیے نا۔

• واقعی سردی بہت سخت پڑ رہی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اسٹول کھسکایا اور چولھے کے قریب آگیا۔

رکھی کی نظریں اس کے رخساروں، آنکھوں، تیزی سے جنبش کرتے ہوئے ہونٹوں اور ہاتھوں کی حرکات پر جمی ہوئی تھیں۔ رکھی دل میں وہ بے چین تشنگی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا جو پیاسے ہونٹوں سے شربت کا گلاس پرے ہٹ جانے سے محسوس ہونے لگتی ہے کامنی نے روٹی الٹتے ہوئے کہا: آپ کو بھوک تو لگ رہی ہوگی؟

اس نے اٹھ کر کامنی کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیئے: نہیں کمو! مجھے بھوک نہیں لگ رہی، یہ کہہ کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ کامنی نے اپنے آپ کو اُس کی مرضی پر چھوڑتے ہوئے کہا، مجھے روٹی تو پکا لینے دیجیے۔

• نہیں جان سے پیاری کمو! روٹیاں پھر پکا لینا یہ کہہ کر اُس نے ہاتھ مار کر توا

چولھے سے گرا دیا۔

وہ خوش تھا اور سرتاپا نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب وہ بیٹھک میں دری پر لیٹا ہوا تھا، ٹانگیں اٹھا کر قریب بچھی ہوئی کرسی پر پاؤں ٹکا رکھے تھے، اور بجلی کی جگ مگاتی ہوئی روشنی میں ویکلی کا پرچہ پیٹ پر دھرے اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر کامنی چولھے کے آگے بیٹھی اس کے لیے پراٹھے پکا رہی تھی۔ اس روز سے پہلے زندگی کے جو دن گزر چکے تھے، وہ بالکل بے کیف نظر آنے لگے، یہ مسرت یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی، دل مطمئن تھا، جسم ہلکا پھلکا اور چست محسوس ہو رہا تھا، روح پر ناقابلِ بیان کیف طاری تھا، آج کامنی اور وہ ایک ہو گئے تھے۔

کھانا تیار ہو گیا تو انھوں نے ایک ساتھ مل کر کھایا، ایک دوسرے کے منہ سے منہ ملا کر نوالے چھینتے رہے، ہنسی مذاق اور چہل میں وقت گزر گیا، اور آخر دروازے پر دستک سنائی دی۔

کامنی نے دروازہ کھولا، بیج ناتھ کا معصوم چہرہ دیکھ کر رکھی کے دل میں فتور پیدا ہو گیا، لیکن کامنی آڑے آئی۔ آپ کے دوست تو اٹھ اٹھ کر بھاگ رہے تھے، بڑی مشکل سے بٹھائے رکھا میں نے۔

بیج ناتھ نے بے تکلفانہ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا، یار کمال کرتے ہو، آخر گھبرانے کی کیا بات تھی؟ دوست کی سادگی اور اخلاص دیکھ کر رکھی کو شرم سی محسوس ہونے لگی اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"کہو کھانا کھا لیا؟"

"ہاں!"

"آؤ تو چلو جیلانی کے ہاں۔"

راستے میں نریج ناتھ دعوت کی باتیں کرتا رہا کہنے لگا، ڈاکٹر شرما میرے بہت گہرے دوستوں میں سے ہیں، بڑے پریم سے کھانا کھلایا، واپس نہیں آنے دیتے تھے، ہزار حیلوں سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔"

جب وہ جیلانی کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں کوئی نزدیکی رشتے دار باہر سے آئے ہوئے ہیں، اس لیے وہ برج نہ کھیل سکیں گے۔ ان کا پروگرام درہم برہم ہو گیا، خیر وہ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے، پھر نریج ناتھ نے کہا: "آؤ گھر بیٹھیں سردی بہت زیادہ ہے۔"

"بھئی اب اجازت دو۔ اب میں گھر واپس جاتا ہوں، پھر ملاقات ہو گی" چنانچہ مصافحہ کر کے وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

آج کے مسرت انگیز واقعے سے اس کا دل اگرچہ مسرور تھا لیکن دوست سے اس پاجی پن کے باعث ضمیر ملامت بھی کرتا تھا اور جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اپنی نیک اور معصوم بیوی کے تصور سے اس کا دل اور بوجھل ہو گیا، بیچاری سردی میں ٹھٹھری ہوئی آگ کے قریب بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو گی

جب وہ جیا کی دکان کے قریب پہنچا تو حسبِ معمول اس سے پوچھا: "کیوں بے جیے کوئی آیا تو نہیں تھا ہمیں ملنے کے لیے؟"

جیا نے سر اوپر اٹھایا، "اجی بابو نریج ناتھ آئے تھے، سیدھے بھیتر چلے گئے، مجھ سے تو کچھ بولے نہیں، جب آپ نہیں آئے تو بیچارے انتظار کر کے چلے گئے۔"

بیج ناتھ؟ اُس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔
ہاں جی! بیج ناتھ بالو۔
دکان سے مکان تک چند قدم کا فاصلہ اُس نے بہت آہستہ آہستہ طے کیا جب وہ سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ کھڑی ہوئی دو انیٹیں پھر اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہیں۔ اس نے احتیاط سے انہیں ٹکا کر رکھ دیا اور پھر ایک لمحہ بھر کے سکوت کے بعد اس کے منہ سے مدھم سی ہنسی نکل گئی اور جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ ماحول پرسکون اور آرام دہ محسوس ہو رہا تھا۔
اس کی بیوی اندر والے دروازے میں کھڑی دکھائی دی۔ وہ اس وقت خوشگفتہ پھول کے مانند تروتازہ اور اجلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پھول جس کا منہ شبنم نے بڑی احتیاط سے دھو ڈالا ہو۔ جس پر جمی ہوئی گرد کی نامعلوم تہہ کسی نے چوم چوم لی ہو۔
وہ بڑھ کر کوچ پر بیٹھ گیا۔ شانتا شاخِ گل طرح لچکتی ہوئی نزدیک آئی اور اس کے قریب کوچ میں دھنس گئی۔ اس نے سر سے پاؤں تک بیوی کا جائزہ لیا اور مسکرا کر بولا "شنو! آج تو تم بہت خوش دکھائی دیتی ہو۔"
اپنے مخصوص انداز میں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ لجا کر مسکرا دی۔ اس کے تروتازہ ہونٹوں سے سپید سپید دانت کسی حد تک نمایاں ہوئے اور اس نے بلا کچھ کہے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے کندھے پر رخسار ٹکا دیا۔
شنو کی نیند کی ماتی پلکیں بوجھل ہو کر جھکنے لگیں۔ وہ چند لمحوں تک شنو کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے کر بولا۔ میں بھی بہت خوش

ہوں سُنو! ذرا اِدھر لانا تو عبداللہ سگریٹوں کا ڈبہ۔"

کرنیل سنگھ

"سکھ جاٹ کی دو چیزوں میں جان ہوتی ہے۔ اس کی لاٹھی اور اس کی گھوڑی (یا گھوڑا) اگرچہ چیزیں پوری ہو جائیں تو انھیں تلاش کرتے میں وہ زمین آسمان ایک کر دیتا ہے۔ اگر کوئی جاٹ سے اس کی یہ چیزیں چھین لینے کی کوشش کرے تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اگر دشمن بھاری پڑے اور اس کی یہ چیزیں چھن جائیں تو وہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرتا ہے۔"

کرنیل سنگھ کے ساتھ دوسری قسم کا حادثہ پیش آیا تھا۔ اس کی خوبصورت تیز خرام گھوڑی چوری ہو گئی تھی۔

وہ لمبا چوڑا بارعب عضو ور زمیندار تھا کس کی کیا مجال کہ اس سے مقابلہ کر کے گھوڑی چھین لے جاتا۔ گھوڑی کے چوری چلے جانے پر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لیکن لاچار تھا۔

چار پانچ دن گزر گئے۔ اس نے مجھے اس حادثے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ایک دن وہ مجھ سے مزید رائے لے گا۔ اگرچہ میں اس کا نوکر تھا اور وہ مجھ سے بڑی بڑی طرح پیش آتا تھا۔ پھر بھی اہم معاملوں میں وہ اکثر میری صلاح لیتا تھا۔

دہی بات ہوئی صبح کا وقت تھا۔ میں گاؤں سے آدھ کوس دور طویلے

کے قریب لگے ہوئے کولھو میں سرسوں پیل رہا تھا کہ پھتا کھانستا ہوا میرے پاس آ کر بولا "قیبلے، تجھے سردار بلا رہا ہے"

میں اصل معاملہ بھانپ گیا۔ میں ابھی تک سوچ نہیں پایا تھا کہ اگر وہ گھوڑی کے بارے میں پوچھے تو میرا مشورہ کیا ہونا چاہیے؟ یوں بھی میں اس کے سامنے جانے سے کتراتا تھا، کیونکہ وہ بنا گالی گلوچ کے بات نہیں کرتا تھا۔ کبھی مجھے بہت تاؤ بھی آتا تو خون کے گھونٹ پیئے بغیر اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا۔ اس کا مقابلہ کرنا بے کار تھا۔ آخر شیر اور بکری کا مقابلہ بھی کیا؟ اگر نوکری چھوڑ دیتا تو میرا لائل پور یا اس کے گرد و نواح میں ٹکنا ناممکن ہو جاتا۔ اور اگر اپنے گاؤں ضلع لدھیانہ میں جا بسوں تو روزی کا سوال حل نہیں ہو سکتا تھا۔

پھتے کی بات سن کر بھی اٹھنے کو جی نہیں چاہا، کیونکہ اس وقت صبح کی مدہم دھوپ میں دل کو بڑا آنند محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اٹھنا ہی پڑا۔ سردار کے منہ کون آئے؟

میں نے پھتے سے کہہ دیا کہ وہ میری جگہ بیٹھ کر ذرا بیل کو ہانکتا رہے مگر پھتا بولا کہ وہ اس وقت کمینوں کو جا رہا ہے۔ میں نے زور دے کر کہا "تھوڑی دیر تو بیٹھو، میں طویلے سے لڑکے کو بھیج دوں گا۔ پھر چلے جانا"

وہ بیٹھ گیا اور پگڑی اتار کر سر کے پٹوں پر ہاتھ پھیرنے لگا اور پھر پگڑی جھاڑ کر اسے از سر نو سر پر لپیٹنے لگا۔

جب میں طویلے کے لمبے چوڑے صحن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کرنیل سنگھ بڑے چھکڑے کی مرمت کروا رہا ہے۔ دوسرے دن گھر کی عورتیں میلے کو جانے

والی تھیں۔ اس کے سلسلے میں یہ تیاری ہو رہی تھی۔ مستری بسولے کی الٹی طرف سے پہیے کی ٹھکائی کر رہا تھا، اور سردار اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا۔

مَیں نے قریب پہنچ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "ست سری اکال سردار جی۔!"

اس نے مجھے کچھ جواب نہ دیا، اور نہ میری طرف دیکھا ہی، بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے میری موجودگی کا احساس تک نہ ہو۔

کافی دیر تک مَیں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھے کھڑا رہا اور سردار کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ۴۵ برس سے اوپر ہو چکا تھا، کچھ بال ضرور پک گئے تھے، لیکن اس کے جسم میں ذرہ بھر کمزوری دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چوڑے نتھنوں والی مردانہ ناک، ہونٹ بھرپور، داڑھی اور سر کے بال گھنے، رنگ تپے ہوئے تانبے کے مانند۔ مَیں اس کے بڑے بڑے ہاتھوں اور چوڑی کلائیوں کو دیکھتے ہوئے دل میں سوچنے لگا کہ کاش مَیں اس سے بھی دُگنے ڈیل ڈول کا مالک ہوتا تو اسے گیند کی طرح اچھال کر پرے پھینک دیتا، وہ سنبھلنے بھی نہ پاتا کہ مَیں اپنا بھاری بھر کم بازو اٹھا کر وہ ہاتھ دیتا کہ گردن مڑ جاتی۔ پگڑی پرے جا گرتی اور اس کا سر کیچڑ میں دھنس جاتا۔ اگلے چاروں دانت ٹوٹ جاتے اور نتھنوں سے خون بہنے لگتا۔ مَیں نے یہیں تک نقشہ کھینچا تھا کہ سردار اپنے مٹکے نما حلق سے بھاری آواز نکال کر بولا۔

"اوئے بھوتیا۔"

"جی سردار جی!۔۔۔" مَیں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

وہ مجھے ہمیشہ اسی نام سے پکارتا۔ میرے سر کے بال جوڑے کے قابو میں نہیں آتے اور داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی اڑے اڑے سے رہتے

تھے۔ میری اسی حالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس نے ایک روز کہا۔ "اوئے تیرا نام تو بھوت سنگھ ہونا چاہیے۔"

اب آپ ہی سوچیے، بھوت سنگھ اور بھوتیا میں کتنا بڑا فرق ہے!

"بھوتیا! گھوڑی کا پتہ نہیں چلا؟"

مجھے کوئی مناسب جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اب تک میرے ذہن میں کوئی ترکیب نہیں آئی تھی۔

مجھے چپ دیکھ کر سردار بولا۔ "اوئے بولتا کیوں نہیں بھوتنیا!"

اب بھوتیا سے بھوتنیا بنا دیا گیا۔

مَیں نے ہڑبڑا کر سوال کیا "آپ نے تھانے میں رپٹ نہیں لکھائی!"

"بھوتنی دا" وہ میری طرف دیکھے بغیر ہنسا۔ "پلس کیا کرے گی ۔۔ اگر مَیں کسی کی گھوڑی لا کر اپنے طویلے میں باندھ لوں تو بتا پلس کیا کرے گی۔۔ ۔۔۔۔ اور پھر پلس کو خبر کرنا کیا مردوں کا کام ہے ۔۔۔۔۔ ہیں؟"

بھوتیا، بھوتنیا اور بھوتنی دا! —— پیچ پیچ گالی دینے میں سردار کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

جیسے کہ مَیں نے اوپر لکھا ہے، سردار اکثر معاملوں میں مجھ سے صلاح مشورہ کرتا تھا۔ لیکن مجھے ایسا ٹیڑھا مسئلہ پہلے کبھی حل نہیں کرنا پڑا تھا۔ لائلپور کے علاقے میں ان دنوں چور ڈاکوؤں کی کمی نہیں تھی۔ اس زمانے میں مسلمان خانہ بدوش بھی پائے جاتے تھے جنکے مرد بڑے وجیہہ اور عورتیں بڑی حسین ہوتی تھیں۔ ان کا داؤ لگے تو ہاتھ مار جاتے تھے۔ اور پھر بار کا علاقہ بھی قریب

ہی تھا، جہاں کے سکھ ان سے بھی بڑے چڑھے تھے، اور جہاں ایک سے ایک دھاکڑ موجود تھا کون جانے اس کام میں کس کا ہاتھ تھا؟ ۔۔۔۔ دو باتیں صاف ظاہر تھیں اول یہ کہ گھوڑی کا چور شوقین مزاج تھا، ورنہ گھوڑی کے علاوہ اور جانور بھی ہانک کر لے جاتا، دوسری بات یہ کہ چور کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، کرنیل سنگھ کی علاقے بھر میں شہرت تھی اور ہر شخص پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی چنانچہ اس کی گھوڑی چرانے کا کام کسی معمولی انسان کا کام ہو نہیں سکتا تھا۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی، مستری کے بسولے کی ٹھکا ٹھک کی آواز گونجتی رہی، لیکن جب چھکڑے کی مرمت ہو چکی تو سردار نے دھیرے سے میری گردن کو پیچھے میں دبوچا اور ایک کونے میں لے جا کر بولا، "یہ کام کسی بڑے حرامزادے کا ہے۔"

"ہاں جی، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" میں نے گلے میں پھنسی ہوئی آواز کو مشکل باہر نکالتے ہوئے کہا۔

سردار نے کچھ دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، اور پھر بولا، "معاملہ ٹیڑھا ہے، اسلیے کسی ٹیڑھے آدمی کی مدد ہی سے یہ گتھی سلجھ سکتی ہے، سمجھے؟"

میرا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا، چنانچہ میں نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ سردار کی بھاری آواز گونجی "کل میلے میں جا کر آنکھیں کھلی رکھو گے تو کوئی نہ کوئی اصلی حرامزادہ تمہیں نظر آ ہی جائے گا جو کانٹے پر پورا اترے تو اس سے

سودا ہو سکتا ہے۔ ایسے آدمی کو جو گھوڑی لے جائے پانچسو روپیہ انعام دینے کو تیار ہوں اور اگر حرامزادے چور کا پتہ نہ مل سکے تو پانچسو اور انعام دے سکتا ہوں۔ بس ایک بار چور میرے چنگل میں آ جائے تو سالے کی گردن مروڑ دوں تاکہ آگے کو سب کو کان ہو جائیں۔۔۔ سمجھے؟"

اب کے میں نے بڑی مشکل سے جواب دیا "جی صاحب"

میں جانتا تھا کہ اب کے بھی میں نے انکار کر دیا تو گالیوں کی بوچھاڑ سہنی پڑے گی۔

سردار نے آخری بار اپنی انگلیوں کو میری گردن پر اس طرح جما دیا! "یہ کام جیسے بھی ہو کرنا ہوگا۔"

دوسرے دن گھر کی عورتیں اور کچھ برادری کی عورتیں اور بچے دو بیل چھکڑوں پر لد گئے اور میں ایک گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ اس شان سے ہمارا قافلہ میلے کو روانہ ہوا۔

آئندہ پنجاب کے میلے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جنگل میں منگل کا سماں بندھ جاتا ہے۔ دور دور تک خیمے اور قناتیں لگ جاتی ہیں۔ مردوں اور عورتوں پر خوب بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ ناچ گانے کا بھی انتظام۔ ڈھول ٹولی غرضیکہ ہر قسم کی رونق نظر آتی ہے۔ رات کے سمے سینکڑوں گیسوں کی روشنی میں دکانیں اپنی بہار دکھاتی ہیں۔ ان دکانوں میں دیہاتیوں کے ذوق اور ضرورت کی اشیاء بکتی ہیں۔

یہ میلہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں متواتر چھ سات دن تک لگتا ہے۔ ہمارا پروگرام چار چھ دن تک رہنے کا تھا۔ اس لیے ہم اپنا خیمہ، آٹا، دال، گھی اور ایندھن وغیرہ

سب کچھ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ چونکہ سردار کے گھرانے کے کئی لوگ ہمراہ تھے اس لیے ہمارے خیمے میں خاصی چہل پہل رہتی تھی۔ سب سے زیادہ رونق سردار کی سب سے بڑی لڑکی لال کور کی وجہ سے تھی اسے سب اکثر لالی کے نام سے پکارتے تھے۔ اپنی جوانی اور حسن کے باعث وہ اپنے باپ سے کم شہرت نہیں رکھتی تھی۔

میلہ کیا تھا جنگل میں ایک چھوٹا سا نگر بس گیا تھا۔ پنگوڑے، مٹی کے برتن۔۔ مسالے دار چاٹ اور مٹھائیوں کی دکانیں تو قدم قدم پر موجود تھیں دیگر کئی قسم کی دکانوں کے علاوہ تفریح کے کئی سامان بھی موجود تھے۔ کہیں پر جے پور اور بھرت پور کی نٹنیاں تماشائیوں کے حلقے میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتیں کہیں ہیر رانجھے کا قصہ سوز بھری آواز میں گایا جاتا۔ کہیں قوالیوں پر لوگ سر دھنتے کہیں بولیاں ٹھولیاں۔

اب کے میلے میں جو نئی چیز دیکھنے میں آئی وہ تھا بولتا، چلتا، پھرتا بائیسکوپ میں نے شہر کے کئی بائیسکوپ دیکھے تھے جن کے مقابلے میں یہ بالکل ہیچ تھا پھر بھی ان دیہاتیوں کے لیے جنہیں شہر جانے کا موقعہ کم ہی ملتا تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز چیز تھی تاروں بھرا آسمان اس بائیسکوپ کی چھت، چاروں طرف قناتیں پردہ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کئی دھوتیوں کو سی کر بنایا گیا ہو۔ ایک جھونپڑی میں مشین رکھی تھی۔ باہر ٹکٹ نہیں بکتے تھے فقط چار آنے نقد دینے پر آدمی کو زمین پر بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی اور آٹھ آنے دے کر آدمی بغیر بازو کے لوہے کی کرسی پر بیٹھ سکتا تھا کھیل شروع ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جب کافی لوگ جمع ہو جاتے تو کھیل شروع کر دیا جاتا۔ مشین ایک تھی اس لیے ہر دس بارہ منٹ کے بعد

کچھ منٹ کا وقفہ ہو جاتا،

ایک شام گھر کے سب لوگوں نے بائیسکوپ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا، چنانچہ رات کے کھانے سے فرصت پاکر ہم لوگ روانہ ہو گئے، ہم سب آٹھ آنے کی کرسیوں پر جا بیٹھے،

کافی دیر انتظار کے بعد کھیل شروع ہوا، دو ریلیں ہو چکیں تو میں نے دیکھا کہ تین چار جوان بڑے دھڑلے سے اندر داخل ہوئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے، یہ معلوم ہونے پر کہ دو ریلیں چل چکی ہیں انہوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر آوازے کسنے شروع کیے، مالک آیا تو اس سے کھیل پھر سے شروع کرنے کے لیے کہا، چنانچہ کھیل از سرِ نو شروع کر دیا گیا، باقی لوگ بھی خوش تھے کہ ان کے دام پھر سے وصول ہو رہے ہیں،

یہ ماجرا دیکھ کر میں ذرا چوکنا ہو گیا، کچھ تو نو وارد دور بیٹھے تھے، اور کچھ تاریکی کی وجہ سے میں ان کی صورتیں اچھی طرح دیکھ نہیں سکا لیکن ایک بات صاف عیاں تھی کہ وہ دھاکڑ لوگ تھے کیونکہ ہر ایرے غیرے کے کہنے پر کھیل پھر سے شروع نہیں کیا جاتا تھا،

میں پچھلے تین روز سے اپنے مالک کے کہنے کے مطابق ایسے آدمیوں کی جستجو کرتا رہا جو ہمارے کام آ سکے لیکن ابھی تک مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی، چنانچہ اب میں نے طے کیا کہ ان جوانوں کا پیچھا ضرور کروں گا، ممکن ہے ان میں سے کام کا آدمی مل جائے،

شو ختم ہونے کے بعد باہر میں نے گیس کی تیز روشنی میں دیکھا تب مجھے یقین

ہوا کہ وہ اصل حرام زادے دِکھاکر دجوان ہیں۔ یوں تو وہ سب کے سب نوجوان لمبے تڑنگے مضبوط ذرا اکھڑ تھے۔ لیکن ان میں سے ایک خاص طور پر میری نظر میں جچ گیا وہ اپنے ساتھیوں میں نہ صرف سب سے طاقتور اور وجیہہ نظر آتا تھا بلکہ بات چیت کرنے کے ڈھنگ سے بھی ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔ میں موقعہ پاکر باتوں ہی باتوں میں اسے ٹٹولنا چاہتا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد ان کا گروہ ایک دکان پہ رُک گیا۔ اس وقت یک بیک اس نوجوان نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دور سے پیڑ کی اوٹ سے ایک عورت کی جھلک دکھائی دی اور وہ اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو کر ادھر کو چل دیا۔ میں بھی کچھ فاصلہ دے کر پیچھے پیچھے ہولیا۔

وہ دونوں کھیتوں میں بنے ہوئے ایک لوہے کے رہٹ کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ میں پودوں کی اوٹ میں لمبا چکر کاٹ کر اُن کے قریب پہنچا تاکہ اُن کی باتیں سن سکوں۔ لیکن وہ اتنی دھیمی آواز میں بول رہے تھے کہ کچھ سمجھنا ناممکن تھا۔

میں دھندلی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ عورت یا لڑکی میری طرف پیٹھ کیے کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس نے منہ پھیرا تو میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ لاآلی تھی۔

عجیب بات تھی، آخر ان کی محبت کب شروع ہوئی تھی؟ یہ ضرور نیا نیا پریم تھا۔ کیونکہ اگر پرانی کھچڑی پک رہی ہوتی تو اب تک یہ بات مشہور ہوگئی ہوتی۔ کیونکہ اگر اس نوجوان کی ہمارے گاؤں میں آمد و رفت ہوتی تو مجھے ضرور پتہ چل جاتا۔ بلکہ سبھی اُسے جاننے لگتے۔

کچھ دیر تک ان میں گھٹ گھٹ کر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر جب لاکی جانے لگی نوجوان نے بڑھ کر اس کا بوسہ لے لیا۔ اس پر وہ یک لخت ہاتھ چھڑا کر پرے ہٹ گئی اور دور سے مسکرا مسکرا کر اسے انگوٹھا دکھانے لگی۔

نوجوان بھی مسکراتا ہوا دوسری جانب چل نکلا۔ میں پاسندوس کے پیچھے ہو لیا۔

چلتے چلتے میلے میں داخل ہونے سے پہلے وہ یک بیک رکا اور گھوم کر میری طرف دیکھنے لگا۔

میرے لیے بھاگ نکلنا یا چھپ جانا ناممکن تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کی طرف دھیان دیے بغیر پاس سے گزر جاؤں گا جب اس کے سامنے پہنچا تو اس نے اپنی لمبی لاٹھی آگے بڑھا کر میرا راستہ روک دیا۔

میں نے جھکی ہوئی آنکھیں دھیرے دھیرے اوپر اٹھائیں۔ کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔ پھر وہ بولا "کہو استاد ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہو؟ جاؤ اپنا کام کرو نا یا اگر اپنی زندگی سے ہی تنگ آ چکے ہو تو بتاؤ، دوں ایک ہاتھ؟"

میں نے بابت بنا کر جواب دیا: "دیکھو سردار بہادر بھلا مجھے تمہارا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے! لیکن میں محض اس لڑکی کی وجہ سے تمہارے پیچھے لگا رہا۔"

اس کے کان کھڑے ہو گئے "کیوں اس لڑکی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"کیا تم جانتے ہو وہ کس کی بیٹی ہے؟"

"نہیں۔"

"واہ جس کے ساتھ پریم کے جھولے جھولتے ہو اس کے بارے میں اتنا بھی نہیں جانتے؟"

"دو تین دن کی ملاقات ہے ابھی اس قسم کی کوئی بات ہی نہیں ہوئی... لیکن تم کون ہو؟"

وہ سردار کرنیل سنگھ کی بیٹی ہے اور میں ان کا پرانا نوکر ہوں۔"

یہ سن کر وہ لمحہ بھر کو چپ رہا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا: "اچھا تو یہ بات ہے، ہاں کرنیل سنگھ کا نام تو میں نے بھی سنا ہے۔"

"ضرور سنا ہوگا، علاقے بھر میں ان کی دھاک ہے۔" اس نے تنی ہوئی مونچھوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا "بھئی! تم تو بڑے کام کے نکلے۔ آؤ، ذرا اونٹنیوں کا دودھ پلاؤں تمہیں، وہیں پر دل کھول کر باتیں ہوں گی۔"

ہم دونوں ساتھ ساتھ چل دیئے۔ ہمارا راستہ شریہنہ کے قد آور درختوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ میں ایسے لمبے چوڑے اکھڑ آدمی کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے ہوئے ڈر محسوس کر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک ہاتھ دے اور میں یہیں پیڑ کے تنے کے قریب ڈھیر ہو جاؤں گی مگر وہ ایسا کمینہ نظر نہیں آتا تھا، وہ چاہتا تو مجھے دن دھاڑے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

میلے کے ایک سرے پر پیڑوں کے نیچے کچھ اونٹنیاں بلبلا رہی تھیں۔ ادھر ادھر کچھ چارپائیاں بچھی تھیں ہم ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ دودھ پی کر اس نے مونچھیں چوستے ہوئے کہا: "بھئی سچی بات یہ ہے کہ لاکی نے تو مجھ پر جادو کر دیا ہے۔"

میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا: "میں صاف کہہ دوں کہ تم

آگ سے کھیل رہے ہو۔"

وہ بے پروائی سے ہنسا "یہ توگ دگ کی دھمکیاں مت دو، سیدھی بات یہ ہے کہ اس لونڈیا کو اپنی جورو بنانے کا ارادہ ہے میرا۔۔۔اب چاہے سیدھی انگلیوں سے گھی نکلے یا ٹیڑھی سے۔"

میں نے ایک بار پھر اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس میں گھبرو جوانوں والی سبھی خوبیاں موجود تھیں۔ میں نے دھیرے سے کہا: "دیکھو سردار بہادر، ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ کام یوں کرے کہ سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"چلو یوں ہی سہی۔۔۔" وہ مسکرا دیا۔

میں کچھ دیر تک چپ چاپ سوچتا رہا، پھر پینترا بدل کر بولا: "اگر تم ہمارے سردار جی کا ایک کام کر دو تو آم اور گٹھلیوں کے دام والی بات ہو جائے۔"

"وہ کیسے؟"

"بات یہ ہے کہ ہمارے سردار جی کی گھوڑی چوری ہو گئی ہے اس کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ اگر کہیں تم اسے ڈھونڈ نکالو تو پانسو روپیہ نقد انعام پاؤ اور اگر چور کو بھی پکڑ دو تو پانسو روپیہ اور ملے گا۔ اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ وہ اتنے خوش ہوں گے کہ انہیں تم جیسے حسین جوان سے لاڈی کا رشتہ کرنے سے بھی انکار نہ ہو گا۔"

"یہ بات ہے۔۔۔ اچھا۔۔۔" یہ کہہ کر وہ سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا "یہ ہے ذرا ٹیڑھی کھیر۔۔۔"

"ٹیڑھی کو سیدھی کرنا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہونا چاہیے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ..."

"لیکن کیا میں تمہیں گھوڑی کا حلیہ بتائے دیتا ہوں ... آخر تم کس چکر میں پڑے ہو، کام مشکل ہے تو انعام بھی تو بڑا ہے۔ اگر تمہیں روپے کی پرواہ نہیں تو لالی کی پرواہ تو ہے۔"

وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا۔ بات یہ ہے کہ مجھے اور سب کام چھوڑ کر یہ کام کرنا ہو گا ... اچھا حلیہ بتاؤ گھوڑی کا۔"

اس پر میں نے گھوڑی کا حلیہ بتایا اور مالک کا پورا پتہ بتا دیا۔ سب کچھ سن کر وہ بولا "یار یوں لگتا ہے کہ یہ گھوڑی میں نے کہیں دیکھی ہے ...۔" پھر وہ انگلیوں سے ماتھے کو دبانے لگا، پھر دفعتاً بولا۔ "اچھا استاد ہاتھ ملاؤ ... مجھے اُمید ہے کہ کام بن جائے گا۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیوں کچھ یاد آیا؟"

"ہاں ... آیا تو ...۔"

"تو پھر کب تک امید رکھی جائے؟"

"دیکھو استاد علاقے میں ایک سے ایک دعا کر ڈپڑھے ہیں، پر ہم شیر کی مونچھ کے بال اکھاڑنے والے آدمی ہیں ... بس اب تہیہ کر لیا ہے کہ یہ کام کر کے لالی کو حاصل کر دوں گا۔ لیکن یاد رکھو اگر لالی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تو تمہاری خیر نہیں ...۔"

ہاں ہاں بے شک لیکن میں مالک سے کیا بتاؤں کہ تم کتنے دن کے اندر یہ کام کر سکو گے؟"

اس نے پھر کچھ دیر غور کیا اور پھر بولا "اچھا صرف دس دن کی مہلت رہے گی . . . . "

یہ طے ہو جانے پر اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد ہم رخصت ہوئے . میں بے حد خوش تھا ،

میلے سے واپس آکر میں نے سردار کو بتایا کہ گھوڑی کا پتہ لگانے کے لیے ایک بڑے دھاکڑ کو گانٹھ آیا ہوں . یہ سُن کر سردار کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا . وہ اس جوان کی شکل وصورت اور ڈیل ڈول کے بارے میں سوالات پوچھنے لگا .
میں نے اس کی خوب تعریف کی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کہیں لالی سے اس کا رشتہ ہو جائے تو جوڑی خوب رہے . لیکن میں نے ان کے عشق کا راز نہیں کھولا . . . . ،

یہ سُن کر سردار نے گھور کر مجھے دیکھا اور گالی دیتے دیتے رک گیا . . . .
ظاہر تھا کہ وہ نیم رضامند ہی تھا ورنہ اس کے منہ میں لگام کون ڈال سکتا تھا .
دن گزرتے گئے . ایک دو . تین . یہاں تک کہ نو دن گزر گئے اور دسواں دن آن پہنچا . اس وقت تک ہم خاصے ناامید ہو چکے تھے ، سردار نے صبح کے وقت ہی مجھے دو چار گالیاں سنائیں لیکن زیادہ کراری گالیاں رات تک کے لیے محفوظ رکھیں . . . . "

میرے دل میں اب بھی امید کی ہلکی سی کرن باقی تھی ، آخر کام بھی تو جان جوکھوں کا تھا . نہ جانے بے چارے کو کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں . . . لیکن مجھے وہ آہنی ارادے والا جوان معلوم ہوا تھا . یہ ناممکن تھا کہ وہ تہیہ کرے اور پھر ناکام

سردار اس ہیرو کو دیکھنے اور گھوڑی واپس پانے کے لیے بے قرار تھا،
ن خیال ہے کہ شاید چور کا بھی سراغ مل جائے کچھ گھڑ بانوں کا انتظام بھی کر رکھا
تھا تاکہ موقع پر کام آئیں ۔

وقت گزرتا گیا، دھوپ ڈھلنے لگی لیکن اس جوان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب
یہ ے مالک کا دماغ پھر بگڑنے لگا، اور میں اس ڈر سے کہ کہیں اس کے قہر کی
دمیں نہ آجاؤں طویلے کے باہر ریت کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا۔ میں دور دور
تک نظروں کو دوڑا رہا تھا، ہر راہگیر پر اسی کا دھوکہ ہوتا۔

اسی اثنا میں طویلے سے سردار کی آواز آئی۔ "ادے بھوتیا!"

آواز کے اندر سے ظاہر تھا کہ اب میری خیر نہیں لیکن اندر جانے کے سوا چارہ کار
نہیں تھا، جاتے جاتے میں ٹھٹکا، دور بہت دور سے ایک سوار دکھائی دیا۔ یوں
تو اس قسم کے کئی سوار آتے جاتے دکھائی دیتے ہی رہتے تھے اور پھر اس قدر
دور سے یوں بھی اسے پہچاننا مشکل تھا لیکن اس سوار کے ہاتھ میں ایک اور
گھوڑے کی لگام تھی جسے وہ تیزی سے بھگائے لیے جارہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد
میں نے اپنی گھوڑی کو کچھ کچھ پہچان لیا، اور پھر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سوار بھی وہی
نوجوان تھا۔

اس پر میں وہیں سے چلا اٹھا۔ "سردار جی گھوڑی مل گئی۔"

سردار باہر نکل آیا۔ اس وقت تک نوجوان اور قریب آچکا تھا، ہم نے
آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ سردار گھوڑی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور

اس نے بڑی گرمجوشی سے اس سوار سے ہاتھ ملایا اور اپنی گھوڑی کو پچکارتا ہوا طویلے کے اندر لے گیا۔

گھوڑی صحن میں باندھ کر سردار نوجوان کا ہاتھ تھامے اس کو دو کمروں میں سے بڑے والے میں لے گیا، اس کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا رہتا تھا۔ اور چھوٹا کمرہ صرف موسم سرما میں مویشیوں کے باندھنے کے کام آتا تھا، بڑے کمرے میں لوہے کی چند کرسیاں اور ایک بڑی سی میز پڑی تھی، یہ سردار کی امارت کی نشانیاں تھیں، اکثر مہمانوں کی مہمانداری یہیں پر ہوتی تھی۔

اس وقت نو وارد جوان کی شکل و صورت قابل دید تھی، وہ ایک لمبا سا لٹھے کا کرتا پہنے تھا، اس پر متعدد سیپ کے بٹنوں والی واسکٹ نیچے مونگیا رنگ کا تہبند، پاؤں میں تیل سے چپڑے ہوئے بھاری بھرکم دیسی جوتے، سر پر کلف لگی، طرہ دار پگڑی جس کی وجہ سے وہ لمبا جوان اور بھی لمبا دکھائی دیتا تھا۔

سردار اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور پانسو روپے کے نوٹوں کی گڈی میز پر رکھ کر کہا: "نوجوان یہ پانسو روپیہ ہے ... ہاں بھوتیا، ذرا لسی شربت کا انتظام تو کرو۔"

نوجوان نے کہا: "دیکھئے لسی شربت کی تکلیف نہ کیجئے کیونکہ مجھے فوراً واپس جانا ہے ... البتہ مجھے آپ سے پانسو روپیہ اور بھی لینا ہے۔"

سردار بولا: "وہ تو چور کو میرے سامنے لے آتے یا مجھے اس کے پاس لے جاتا تو ..."

"میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

سردار نے ذرا تامل کیا۔ پھر بھاری آواز میں بولا "اچھا تو یہ بات ہے۔۔ میں سمجھا کہ شاید چور تمہاری جان پہچان والا ہے اور تم اس کا پتہ نہیں بتانا چاہتے۔"

نوجوان نے چمکدار آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ایسے معاملے میں میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔"

"تو ٹھیک ہے۔۔۔۔ گویا تم ہمیں چور کے پاس لے چلو گے۔"

"ہاں۔۔۔۔ آپ کے آدمی تیار ہیں کیا؟"

"ہاں ہمارے آدمی تیار ہیں۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔۔۔۔ میں چور سے آپ کا سامنا کرا دوں گا اور اپنی راہ لگوں گا۔۔۔۔ اس کے بعد آپ جانیں اور وہ چور۔"

"منظور ہے۔"

"بُرا نہ مانیے تو وہ روپیہ میرے حوالے کر دیجیے کیونکہ میں روپیہ لینے کے لیے واپس نہیں آؤں گا۔"

سردار نے نوٹوں کی دوسری گڈی نکالی اور میز پر رکھ دی۔ اور مجھ سے کہا۔ سب آدمیوں سے کہو گھوڑیاں کس لیں۔

میں نے دروازے میں سے باہر جھانک کر صحن میں کھڑے آدمیوں سے پکار کر کہا: "سردار جی کہتے ہیں گھوڑیاں کس لو سب لوگ۔"

نوجوان نے ایک گڈی تہبند کے دائیں پلو اور دوسری بائیں پلو میں لپیٹی اور کس کر انہیں تہبند کے اندر مضبوطی سے اڑس لیا، پھر اس نے اپنی لمبی مضبوط لاٹھی پر چمکیلی چھوی چڑھائی اور دیوار کی طرف پیٹھ کر کے سیدھا سپاہیانہ انداز

سے کھڑا ہو گیا، مونچھوں کو انگلیوں سے چھو کر بھرپور آواز میں بولا: آپ کی گھوڑی کا چور آپ کے سامنے کھڑا ہے۔

اس کی یہ بات مجھے یوں لگی جیسے بم کا گولہ پھٹ گیا ہو۔۔۔ مجھے تعجب ہوا۔ کیا واقعی ؟ لیکن سچ مچ ہمارے سردار کی گھوڑی چرانا معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ دوسرے ہی لمحہ میں مجھے خوشی کا احساس ہوا، دیکھنا یہ تھا کہ اب سردار کیا کرتا ہے، کیونکہ اتنے برسوں میں میں نے کسی کو اس قدر جرأت کے ساتھ للکارتے نہیں دیکھا تھا۔

ادھر سردار بت بنا کھڑا تھا، یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اس کے سارے بدن کا لہو اس کی آنکھوں میں دمک رہا ہو، مارے غصے کے اس کے ہونٹ لرز رہے تھے، لیکن بات منہ سے نہیں نکلتی تھی۔

غالباً سردار دوسرے آدمیوں کو بلانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا ادھر وہ نوجوان بڑی دلجمعی سے پانی کے گھڑے کی طرف بڑھا قریب پڑے ہوئے کانسی کے کٹورے کو اٹھا کر اس میں پانی بھرا اور اطمینان سے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

سردار دروازے کے قریب کھڑا اس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔۔۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔۔۔۔ نوجوان نے پانی پی کر انگوچھے سے مونچھیں پونچھیں اور چھوی والی لاٹھی کو ہاتھ میں تول کر دروازے کی جانب بڑھا، جدھر سردار کھڑا تھا، کیونکہ اس دروازے کے سوا باہر جانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

سردار کی مٹھیاں بند ہو ہو کر کھل رہی تھیں اور کھل کھل کر بند ہو رہی تھیں

نوجوان اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دھیرے دھیرے قدم بقدم اس کے پاس پہنچا، ٹھٹھک کر دہ کا۔ لمحہ بھر کو دونوں کی آنکھیں ملیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب وار ہوا کہ ہوا۔ لیکن سردار نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔

نوجوان آگے بڑھا اور طویلے کے صحن میں سے ہو کر بڑے دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ سردار قدرے تامل کے بعد اس کے پیچھے گیا اور طویلے کے صحن کے بڑے دروازے پہ جا کر رک گیا۔

ہمارے لٹھ باز سردار کے حکم کے منتظر تھے۔ وہ نوجوان بے اعتنائی سے چلتا ہوا اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا اور سوار ہونے سے پہلے اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ پھوٹ رہی ہو جیسے وہ مجھے میرا وعدہ یاد دلا رہا ہو۔ اس کے بعد وہ ایک ہی جست میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔۔۔"

سردار نے لٹھ بازوں سے اب بھی کچھ نہیں کہا۔ یہاں تک کہ گھوڑا سوار مدھم دھوپ میں کھیتوں میں سے ہوتا ہوا، بہت دور نکل گیا۔

میں سردار کے پیچھے کھڑا تھا جبکہ وہ ایک کندھا بڑے دروازے کی چوکھٹ سے ٹیکے چپ چاپ کھڑا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے یہ جاننا محال تھا کہ اس کے چہرے کے جذبات کیا ہیں؟۔۔۔

تھوڑی دیر بعد اس نے میری جانب دیکھے بغیر بے کیف اور بھاری آواز میں سوال کیا "تم اسی نوجوان کا رشتہ لالی کے ساتھ کرنے کو کہہ رہے تھے؟"

میرے ہونٹ، زبان اور حلق چشم زدن میں خشک ہو گئے اور میں

ڈر کے مارے کچھ جواب نہیں دے سکا۔۔۔۔ اس پر سردار نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔۔۔۔۔ اس کے موٹے ہونٹوں پر، گھنی مونچھوں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے۔۔۔۔ ایک موہوم سی مسکراہٹ جنم لے رہی تھی

خوشبودار موڑ

ہمیشہ کی طرح اس روز بھی دفتر کا کام ختم ہوتے ہی لطیف صاحب کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ سائیکل کے پیڈل گھماتے گھر پہنچے تو بالکل نڈھال ہو گئے شاید یہ تکان اتنی جسمانی نہیں تھی جتنی نفسیاتی۔ اسکوٹر خرید سکتے تھے لیکن سائیکل سے نباہ کئے جا رہے تھے۔ اس خیال سے کہ جو رقم اس پر خرچ کریں گے وہ بچوں کے کام آجائے گی۔

انہوں نے گھر میں گھستے ہی سائیکل کو دیوار سے یوں دے مارا جیسے اب اس نگوڑی کو کبھی مونہہ نہ لگائیں گے۔ لیکن یہ تو ہر روز کا چلن تھا، دوسرے دن پھر اسی نگوڑی سے ملن ہو جاتا۔۔۔ ان کی اس حرکت سے یعنی سائیکل کو دیوار سے ٹکرانے سے گھر والوں کو ان کی آمد کی خبر ہو جاتی بچے بالملاحظہ، ہوشیار ہو جاتے، نوکرانی دیدے چمکاتی ہوئی بیگم کو صاحب کی تشریف آوری کی خبر سناتی، اور صاحب زخمی بھینسے کی طرح کرسی پر گرنے سے پہلے دونوں گھٹنوں پہ ہاتھ مار کر یا اللہ کہتے اور پھر ڈھیر ہو جاتے۔

سامنے دیوار پہ کسی زمانے میں ان کی دادی اماں نے ایک بڑا سا ”یا اللہ“ کا طغرہ چوکھٹے میں جڑوا کر لٹکایا تھا۔ اس وقت انھیں دادی کی حرکت عجیب

سی لگی تھی۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ ایک روز وہ بھی آئے گا جب بغیر یااللہ کہے اُٹھ سکیں گے نہ بیٹھ سکیں گے۔

نوکرانی ایک ہاتھ میں سلپچی اور دوسرے میں نیم گرم پانی کا لوٹا لائی۔ انہوں نے کرسی پر لیے ہاتھ دھوئے، مونہہ تر کیا، تولیہ جھپٹ کر نوکرانی کے ہاتھ سے لیا، چہرے پر قدرے رونق آئی۔ اتنے میں بیگم بڑے پیارے انداز میں دونوں ہاتھوں سے چائے اور ناشتہ کی ٹرے سنبھالے کمرے میں داخل ہوئیں وہ دل میں جانتے تھے کہ قربانی کا بکرا ہوں شادی کی تو بیگم نے بڑے بھولپن سے نصف درجن کے آس پاس بچے ان پر عائد کر دیئے اور خود فرشتوں کی سی معصومیت طاری کر کے الگ ہو بیٹھیں۔۔۔ چنانچہ اب انہیں اپنے ہی قدموں کے نقوش پر سجدے کرنے پڑ رہے تھے۔

بیگم کسی زمانے میں کانونٹ میں تعلیم حاصل کرتی رہی تھی۔ لیکن ایسی سگھڑ گرہست بن گئی تھیں کہ میاں کے لیے باجرے کی میٹھی ٹکیاں تک تیار کرنے سے گریز نہ کرتی تھیں۔ بھلا باجرے کی ٹکیہ بھی کوئی کھانے کی چیز تھی۔ لیکن میاں کے ذوق پر تنقید کرنا مصلحت سے خالی تھا۔ لطیف صاحب نے بھی پہلے اپنا ہاتھ ٹکیہ کی طرف بڑھایا۔ بیگم سے دو تین گھڑی گھڑائی مسکراہٹوں اور بنی بنائی باتوں کا تبادلہ ہوا، پھر وہ حقہ بھروانے کے لیے تشریف لے گئیں

حقہ تازہ ہو کر آیا تو لطیف صاحب دو چار کش لے کر تازہ دم ہو گئے۔ اتنے میں تمباکو کی روح افزا بو کے ساتھ ساتھ ایک خوش بو ان کی ناک تک پہنچی۔ حیرت سے انہوں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو پتہ چلا کہ یہ خوش بو

ایک بڑی سی پلیٹ میں سے آرہی تھی جس میں آج کی ڈاک جمع تھی کچھ رسالے تھے، کچھ خط۔

کسی زمانے میں جب وہ خود بھی جوان تھے اور دل بھی جوان رکھتے تھے تو جلالؔ کے شاعر سمجھے جاتے تھے جی ہاں بابا کے تو عمر اشعار ابھی سہی لیکن اظہار یا ادائیگی کا جواب نہیں تھا۔ وہ جنون اب بھی کسی حد تک موجود تھا اگر نہ سہی راکھ کی صورت، اسی کے طفیل کچھ رسالے مفت آجاتے کچھ خوشامدانہ تعریفی خط آسکتے۔ لیکن یہ خوشبو ایک لفافے میں سے آرہی تھی۔ لطیف صاحب کو اپنی ناک یا لفافے پر اعتبار نہیں آیا چنانچہ لفافہ اٹھا کر ناک تک لے گئے ہاں یہ خوشبو اسی لفافے کی شرارت تھی۔

اتنے میں بیگم صاحب کسی کام سے اندر آئیں۔ حالاں کہ انہوں نے میاں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ لیکن میاں نے نہایت صفائی سے لفافہ قمیض کی جیب میں ڈال لیا۔ ناشتہ جلدی جلدی ختم کیا اور پھر حقہ اٹھا کر اپنی نشست گاہ کی طرف بھاگے۔ دفتر سے لوٹنے کے بعد وہ باہر کے برآمدے میں ڈیرہ جمایا کرتے تھے۔ سردی کی وجہ سے آج کل برآمدے کے تین جانب ٹاٹ کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک تخت اس پر گدا، سفید چادر، گاؤ تکیہ، یعنی عیش کا سامان یہیں بیٹھ کر وہ حقہ گڑگڑاتے، ہلکا پھلکا مطالعہ کرتے اشعار کو عرش سے فرش پر اتارتے۔ ڈھلے، ادھیڑ عمر کے یا عمر رسیدہ دوست اور محلے دار جمع ہو جاتے۔ گفتگو کی ابتدا بیماریوں کے رموز بیان کرنے سے ہوتی اور انتہا اشعار کے سننے سنانے پر۔

دوستوں کے آنے میں دیر تھی، اس لیے انہوں نے دوسرے خط
پڑھ ڈالے، رسالوں کی سرسری ورق گردانی کی، خوشبودار لفافے کو نہیں
پڑھا ابھی وہ اس حرکت سے محظوظ ہو رہے تھے، زنانہ خط معلوم ہوتا تھا
ذہن میں یہ شبہ بھی سر اٹھاتا تھا کہ ممکن ہے وہ چھٹی کسی خاتون کی نہ ہو لیکن پھر
بھی دل اڑیل خچر کی طرح دولتیاں جھاڑے جا رہا تھا

آخر موقع پاکر انہوں نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے لفافہ کھولا اندر
کا کاغذ خوشبو میں نہایا ہوا تھا سب سے پہلے انہوں نے نیچے نظر ڈالی نسیمہ
...... بے شک لڑکی کا خط تھا

محترمی، آداب

مدت سے آپ کو خط لکھنے کی سوچ رہی تھی لیکن ہمت
نہیں پڑتی تھی۔ آپ کا کلام اکثر رسائل میں دیکھتی رہتی ہوں، بارہا جی چاہا کہ اپنے
محبوب شاعر کو چھٹی لکھوں لیکن یہ سوچ کر رہ جاتی کہ نہ جانے آپ کیا سمجھیں، میرا
مطلب ہے کہ غلط مطلب نہ سمجھیں، سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے الگ نوٹ بک
بنا رکھی ہے جس میں محض آپ کا کلام جمع کرتی رہتی ہوں۔

مجھے چھٹی لکھنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا لکھ رہی ہوں
ابھی میں بی اے میں پڑھتی ہوں، ڈرتی ہوں کہ آپ اسے میری بدتمیزی نہ سمجھیں
میں تو آپ کا رتبہ میر اور غالب سے کم نہیں سمجھتی لیکن آپ کی نظر میں میری رائے
کی کیا وقعت ہو سکتی ہے ...... اب کچھ اور کیا لکھوں۔ آپ سے درخواست ہے
کہ مجھے چھٹی ضرور لکھیں۔ ہو سکے تو فوٹو بھی بھیجیں پتہ ڈاک خانے کی معرفت

میرے نام کی جگہ نسیم احمد لکھیں،
کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو اس کے لیے معافی چاہتی ہوں۔
آپ کی ...... نسیمہ

یار دوست آئے، گپ شپ ہوتی رہی۔ ان کے جانے کے بعد بال بچوں میں بیٹھ کر کھانا کھایا، بیگم سے ادھیڑ عمر کی چہل بازی بھی ہوئی...... لیکن یہ سب یوں لگ رہا تھا جیسے خواب دیکھ رہے ہوں، بیگم دن بھر کے کام سے تھک ہار کر پلنگ پر لیٹ گئیں، پہلو والے پلنگ پر میاں لیٹے تھے۔ چند منٹ کے بعد بیگم نہایت سبک قسم کے خراٹے لینے لگیں۔ میاں نے پھر خوشبودار چٹھی نکالی۔ اسے بار بار پڑھا، جیسے ایک ایک سطر کو سجدہ کر رہے ہوں، انہوں نے بیگم پر نظر ڈالی جو ان کی طرف پیٹھ کیے سو رہی تھیں، گھنے بال شانے پر ڈھلک آئے تھے۔ بیچ بیچ میں سفید بال بھی دکھائی دے رہے تھے، پھر بھی اپنی عمر کے لحاظ سے وہ پرکشش تھیں لیکن نسیمہ!
بھلا نسیمہ کو فوٹو کیسے بھیجیں، نہ جانے وہ ناتجربہ کار لڑکی اپنے تصور میں ان کی صورت کا کیا نقشہ بنائے بیٹھی ہو، لیکن آج کل کے فوٹوگرافر بھی تو اپنے فن کے استاد ہوتے ہیں چاہیں تو انہیں حسین اور جوان بھی دکھا سکتے ہیں، خیر شکل تو ان کی بری نہیں مگر عمر کا کیا علاج؛ فوٹو کے بعد نسیمہ ان سے ملاقات ہونے پر یہی سوچے گی کہ آنا چاہیے تھا لطیف میاں کو لیکن چلے آئے ان کے ابا جان، اس موقع پر فوٹو اور اصل صورت کے تضاد کی کیا تاویل پیش کر سکیں گے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فوٹو کے ساتھ لکھ دیں کہ نیا فوٹو کھنچوانے کی فرصت نہیں ملی اس لیے ذرا پہلے کا فوٹو بھجوا رہا ہوں، معقول، لیکن ابھی فوٹو بھیجنے کی جلدی نہیں ہے، پہلے تو اس چٹھی

کا جواب دینا چاہیئے. قلم ہاتھ میں تھام کر وہ عجب کشمکش میں پڑ گئے، آغاز کس طرح ہو، مضمون کیا رہے، اور اختتام؟ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ابھی تو ایک چھٹی یوں ہی لکھی جائے بعد میں نقل ثانی کر کے مناسب الفاظ یا فقرے لکھے جا سکتے ہیں. لکھا ر

پیاری نسیمہ، آداب

یاد آوری کا شکریہ. آپ کی چھٹی نسیم سحری کی طرح آئی اور میرا دامن خوش بو سے بھر گیا.

آپ مدت سے مجھے چھٹی لکھنے کی سوچ رہی تھیں تو پھر ہچکچاہٹ کیسی. میں شاعر ہوں آپ جانتی ہی ہیں کہ شاعر قلندر ہوتے ہیں. قلندروں کو جس کا جی چاہے چھٹی لکھے اور پھر ایسے خطوط تو اکثر آتے ہی رہتے ہیں. میرے لیے یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں.

درست ہے. خوشامد کسی بھی سنجیدہ انسان کو پسند نہیں آتی لیکن سچی تعریف سے کسے خوشی نہ ہوگی. آپ کے ایک ایک لفظ سے خلوص کی بو آتی ہے. اس عمر میں آپ میرا کلام سمجھ سکتی ہیں، یہ کوئی معمولی بات نہیں. اسی سے میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آپ کتنی قابل اور ذہین ہیں.

لیجئے آپ کو چھٹی تو میں نے لکھ ہی دی لیکن فوٹو بعد میں کھنچوا کر بھیجوں گا.

آپ کا...... لطیف

لکھ کر چھٹی پڑھی تو چند تبدیلیوں کا خیال آیا. مثلاً "پیاری نسیمہ" لکھنا مناسب نہیں. تعلقات بڑھ جانے پر چاہیے....

لطیف صاحب نے فیصلہ کیا کہ دوسرے روز نئے سرے سے چھٹی لکھیں گے پھر وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اپنے آپ کو فوٹوگرافر

کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے۔

نسیمہ نے دو چٹھیاں اور لکھیں جن میں بڑے اصرار سے فوٹو کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے متعلق لطیف صاحب نے پہلے ہی سے بہت کچھ سوچ رکھا تھا اس لیے ایک روز ایک فوٹو گرافر کی دکان میں جا گھسے۔ وہاں کچھ اور گاہک بھی موجود تھے لیکن ان کی معزز صورت دیکھ کر فوٹو گرافر پہلے انہیں کی طرف متوجہ ہو گیا "فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

لطیف صاحب بڑبڑا گئے پھر سنبھل کر بولے "جو اصحاب مجھ سے پہلے کھڑے ہیں آپ ان سے نمٹ لیجیے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے ۔۔۔ میں انتظار کر سکتا ہوں ۔۔۔ اتنی دیر میں میں دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھ لوں گا۔"

پیٹھ پر ہاتھ باندھ کر لطیف صاحب فوٹو دیکھنے لگے اور فوٹو گرافر اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دل ہی دل میں لطیف صاحب ڈانواڈول ہو رہے تھے، کبھی جی چاہتا کہ چپکے سے بھاگ نکلیں، کبھی خود ہی اپنے آپ کو ڈانٹ دیتے کہ آخر یہ کیا بزدلی ہے۔

اتنے میں فوٹو گرافر کی آواز سنائی دی "مجھے فرصت ہو گئی۔ کہیے!"

لطیف صاحب فوٹو گرافر سے نظر نہیں ملا رہے تھے۔ بولے "میں فوٹو کھنچوانا چاہتا ہوں۔"

"ابھی؟"

"جی ابھی ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کو فرصت ہو تو۔"

"کیوں نہیں کیوں نہیں۔ آخر ہم لوگوں کا اور کام ہی کیا ہے کون سا

"سائز؟ لطیف صاحب نے سن رکھا تھا کہ پاس پورٹ سائز، کارڈ، کیبنٹ سائز ہوتے ہیں لیکن ذہن میں یہ بات صاف نہیں تھی کہ ان کا طول و عرض کیا ہوتا ہے۔ فوٹوگرافر نے دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کے سائز بتا دیئے تو انہوں نے کیبنٹ سائز پر انگلی رکھ دی۔

فوٹوگرافر نے کہا "آیئے اسٹوڈیو میں۔۔۔۔"

لطیف صاحب پیچھے پیچھے چلے، فوٹوگرافر تو سٹینڈ پر رکھے چوکور کیمرے سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا اور لطیف صاحب کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کھڑے ہوئے اپنی صورت دیکھ کر دل میں کہا کہ آخر یہ میں کیا کر رہا ہوں، یہ مونہہ اور مسور کی دال! باسی کڑھی میں یہ ابال!۔۔۔ کنگھی سے بال سنوارے، ٹائی کی گرہ درست کی، پھر شرما کر اپنا عکس دیکھا اتنے میں فوٹوگرافر نے انہیں کرسی پر بیٹھنے کو کہا، بیٹھ گئے، فوٹوگرافر کا سر کیمرے پر اوڑھے ہوئے کالے کپڑے میں غائب ہو گیا۔ ادھر انہیں پسینہ چھوٹ رہا تھا دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ اس کی دھڑکن صاف سن رہے تھے، معاً انہیں خیال آیا کہ کہیں شکل بھول کی توں آگئی تو کیا ہو گا گھبرا کر کھڑے ہو گئے، فوٹوگرافر نے چادر میں سے سر نکال کر پوچھا "آپ۔۔۔ کیا کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوائیں گے۔"

لطیف صاحب نے فوٹوگرافر کی طرف یوں دیکھا جیسے بکرا قصائی کو دیکھتا ہے "میں۔۔۔ میں۔۔۔ در اصل۔۔۔" ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں انہوں نے مدعا بیان کیا فوٹوگرافر اشارہ سمجھ کر اور انہیں دونوں کندھوں سے دبا کر کرسی پر

بطلتے ہوئے بولا، آپ چنتا مت کیجئے۔۔۔ میں آپ کی صورت سے بیس سال اڑا دوں گا۔"

لطیف صاحب کو فوٹو گرافر سے نفرت سی محسوس ہوئی گنجا کہیں کا، معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دکان پر اکثر اسی قسم کے لوگ آتے ہیں، جب ہی تو ان کے دل کی کیفیت کو اس قدر آسانی سے بھانپ گیا۔

فوٹو تیار ہو کر آیا تو اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہی پر پچے لطیف صاحب ہیں۔ تنہائی میں بیٹھ کر لطیف صاحب بار بار اسے نسیمہ کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے، بہانہ معقول تھا کہ تازہ فوٹو کھنچوانے کی فرصت نہیں ملی، پرانا فوٹو آپ کے اصرار پر بھیج رہا ہوں۔

نسیمہ نے لکھا کہ فوٹو پا کر میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ جواباً اس نے بھی فوٹو بھیجنے کا وعدہ کیا۔ لطیف صاحب نے لکھا کہ ایک گنجا فوٹو گرافر میرا واقف ہے۔ آپ کو لے جا کر اسی سے فوٹو۔۔۔ بلکہ دونوں ایک ساتھ فوٹو کھنچوائیں گے۔۔۔ نسیمہ کو یہ رائے بہت پسند آئی۔ اب اس کی جانب سے ملاقات کے لیے اصرار ہونے لگا لطیف صاحب اس بات سے گھبرا تو رہے تھے، لیکن کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ان کے درشن پا کر کہیں نسیمہ بھڑک نہ جائے یہی غم کھائے جا رہا تھا۔ کہیں مجھے یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ بلایا تھا لطیف صاحب کو آ گئے ان کے ابا مرحوم۔۔۔ یا عنقریب مرحوم ہونے والے

اسی ادھیڑ بن میں وہ ایک روز کافی ہاؤس میں کافی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ دنیا جانتی ہے کہ کافی ہاؤس میں من چلوں کی بھیڑ رہتی ہے زیر آسمان

کوئی ایسا موضوع نہیں جس کی دھجیاں وہاں نہ اڑائی جاتی ہوں۔ قریب کی میز سے کچھ آوازیں ان کے کانوں میں پہنچیں۔ اتفاق سے موضوع ان کی دلچسپی کا ہی تھا۔ ارے صاحب! عورت آنکھوں سے نہیں کانوں سے محبت کرتی ہے اس کا دھیان آپ کی صورت کی طرف نہیں، آپ کی باتوں کی طرف ہوتا ہے۔

یہ الہامی الفاظ سن کر لطیف صاحب بڑے مصمم ارادے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ملاقات کے لیے ایک پارک کا انتخاب ہوا۔

نسیمہ کی بلند خیالی اور خوش ذوقی میں شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ جس لڑکی کو ادب سے اتنا گہرا لگاؤ ہو بھلا وہ صورت اور عمر دیکھے گی یا ان کا ادب میں رتبہ اور شہرت دیکھے گی۔ ملاقات کے روز بن ٹھن کر گھر سے نکلنے لگے تو بیگم نے ابروؤں کو مخصوص انداز میں جنبش دے کر پوچھا "آج چھیلا بن کر کہاں چلے"۔

لطیف صاحب نے ایک خاص ادا سے پیشانی پر گری سرمئی رنگ کی لٹ کو سر کی ایک جنبش سے پیچھے جھٹکتے ہوئے جواب دیا، کیا پوچھتی ہو بیگم! آج کل زندگی کے نہایت خوشبو دار موڑ سے گزر رہا ہوں"۔

ایسے مذاق چلتے ہی رہتے تھے۔ بیگم پڑھی لکھی خاتون تھی بُرا نہیں مانتی تھی۔ گھر کے دروازے کی طرف بڑھے تو دل میں خیال آیا کہ کہیں بیگم کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔ چنانچہ بولے "بیگم برا نہ ماننا میں نے مذاق میں یہ بات کہہ دی۔ تم کچھ اور نہ سمجھ بیٹھنا۔ دفتر میں ایک میٹنگ ہے وہیں جا رہا ہوں"۔

بازار سے گزرتے وقت انہیں خیال آیا کہ نسیمہ کے لیے کوئی تحفہ لے لیتے تو اچھا رہتا۔ اتنی جلدی میں کیا ہو سکتا تھا۔ ایک دکان کے سامنے رُکے اور کچھ

نہیں تو انہوں نے عطر کی ایک نہایت حسین شیشی خرید لی۔

پارک میں جاکر وہ مولسری کے پیڑ تلے بچھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گئے اور انتظار کی گھڑیاں گننے لگے۔ مقررہ وقت بھی گزر گیا۔ ان کی متجسس نظر ہر چہار جانب گھوم رہی تھی۔ کہ نہ جانے تقدیر کا ستارہ کس گوشے میں چمک اٹھے۔ آخر وہ لڑکی تھی۔ اس کا اتنی جلدی اور آسانی سے دہلیز سے باہر قدم رکھنا آسان تو نہ تھا۔

پارک کے گوشے سے ایک برقعہ والی آتی دکھائی دی۔ وہ سمجھ گئے کہ بہ سوا نسیمہ کے اور کوئی خاتون ہو ہی نہیں سکتی۔

اِن کا خیال درست نکلا۔ بدکتی ٹھٹکتی برقعہ والی ان کے پاس پہنچ ہی گئی۔ (دل اچھل پڑا) آخر اس نے پہچان لیا انھیں۔ فوٹو اور اصل صورت میں شاید اتنا فرق نہ ہو جتنا وہ سمجھ بیٹھے تھے۔

پتلون کی کریز چٹکی میں تھام کر وہ سرو قد کھڑے ہو گئے۔ "آداب عرض۔"

"آداب عرض۔" پھسپھساتی ہوئی آواز سنائی دی۔

تشریف رکھئے۔

وہ دونوں بنچ کے دونوں سروں پر بڑے قاعدے سے بیٹھ گئے لڑکی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ کھلاہٹ میں سمجھ نہیں سکے کہ گفتگو کا آغاز کیسے ہو۔ کچھ نہیں سوجھا تو بولے "وہ جو فوٹو میں نے آپ کو بھیجا تھا۔"

پہلی ملاقات بڑی پھسپھسی رہی برٹی مختصر، بے جان، غیر رومانی۔ اس رات لطیف صاحب سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جس گھڑی کا انتظار تھا وہ

کس قدر دبے پاؤں آئی اور گزر گئی، نسیمہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی، مارے گھبراہٹ کے اس کی آواز تک نہیں نکل سکی...ملاقات ستنی خیز تھی لیکن ... بس!

رفتہ رفتہ لطیف صاحب نے تسکین کا پہلو نکالا، دل کو سمجھانے لگے کہ یہ کیا کم تھا کہ ایک پردہ دار لڑکی گھر سے نکل کر ان تک پہنچ گئی، انہیں پہچان لیا، پہچان کر مایوسی کا اظہار نہیں کیا بلکہ پھر ملنے کا وعدہ کیا۔

حقہ کا دھواں اڑاتے لطیف صاحب نے سوچا کہ وہ دن دور نہیں جب نسیمہ ان سے خوب کھل جائے گی، تب اس پہلی ملاقات کا ذکر کر کے وہ خوب ہنسیں گے" پوچھیں گے "صورت نہ دکھائی تو کم سے کم اپنی سریلی آواز سے محفوظ ہونے کا موقع ہی دیا ہوتا۔

چہرہ گلنار ہو جائے گا، کیا کرتی، گھبراہٹ بہت تھی، آپ کیا جانیں میں گھر سے کیسے نکل کر آئی، دیکھ نہ لے کوئی پوچھ نہ بیٹھے، واپسی پر جرح نہ ہونے لگے.....اور پھر آپ کا رعب الگ۔

"میرا رعب!....کیا فرماتی ہیں، سچ ہے اور کمیٹی تک میرا رعب مانتے ہیں۔ بہت ہنسی چھوٹے گی، عورتیں بھی کتنی خوش ہو جاتی ہیں روتے اور ہنسنے پر ہر دم آمادہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آنکھوں میں آنسو، آخر دونوں میں فاصلہ ہی کیا ہے!

اسی قسم کی بے رس غیر رومانی ملاقاتیں دو تین بار ہوئیں لیکن نسیمہ کا رویہ نہیں بدلا، نہ نقاب اٹھی نہ آواز نکلی، ڈری ڈری، گھبرائی گھبرائی سہمی ملاقاتیں

آخر طے پایا کہ پارک میں صحیح معنی میں ملاقات ہو ہی نہیں سکتی، ریل کا ڈبہ ہوٹل کا کمرہ، کسی دوست کا گھر؟ ۔۔۔ نہیں مزا نہیں آئے گا، خطرے سے خالی نہیں۔

خود لطیف صاحب کا گھر کیسا رہے گا۔ کسی بھی چھٹی کے دن بیوی بچے کسی رشتہ دار کے ہاں جا سکتے ہیں، دوپہر کے کھانے کے بعد گھر سے جائیں اور رات کا کھانا کھا کر لوٹیں۔ اس دوران میں ان دونوں کی کھل کر ملاقات ہو سکتی تھی۔

یہ تجویز معقول تھی، بیگم جب موقع پاتیں کسی نہ کسی رشتے دار کے گھر کو چل دیتی تھیں اس لیے اگلے اتوار کو انہیں گھر سے کھسکا دینا مشکل نہ ہو گا۔ لطیف صاحب نے کہا۔ "امید ہے کہ اس دن آپ کو کھل کر بات چیت کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو گی۔"

"نہیں" نسیمہ نے جواب دیا۔

پل پل گنتے رہے، سنیچر کے روز اتوار کا پروگرام طے ہو گیا۔ ایک رشتہ دار کو مطلع کر دیا گیا کہ دوپہر سے رات کے کھانے تک بال بچے اور بیگم ان کے گھر دن دنائیں گے ۔۔۔ اور جب دوپہر کے بعد یہ کارواں گھر سے روانہ ہو گیا تو لطیف صاحب نے اطمینان کا سانس لیا، انہوں نے کمروں کے فرنیچر اور دیگر چیزوں کو باقاعدہ اپنی اپنی جگہ پر سکا دیا۔ اپنی دبیز بیاض کو جھاڑ پونچھ کر میز کے ایک کونے میں سرکا دیا۔

نسیمہ نے بھی پوری تیاریاں کر رکھی تھیں لطیف صاحب وقت

مقررہ پر پارک میں نسیمہ کو لینے پہنچے۔ دو رکشاؤں کا انتظام تھا تاکہ راستے
میں کوئی واقف کار مل جائے تو شبہ نہ ہو۔ دونوں رکشا آگے پیچھے چلے اپنے
مکان کے قریب پہنچ کر لطیف صاحب نے رکشا رکوا دیئے اور نسیمہ کے پاس
جاکر پھسپھسائی آواز میں بولے "آپ مجھے دیکھتی رہیے، سامنے ہی ہمارا مکان
ہے۔ میں تالا کھول کر اندر داخل ہو جاؤں تو آپ بھی چلی آیئے گا"

نسیمہ نے سر ہلا کر حامی بھری۔

قفل کھولا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی لطیف صاحب دھڑکتے ہوئے
دل سے نسیمہ کا انتظار کرنے لگے ...... نسیمہ نے بھی آنے میں دیر نہیں لگائی۔۔
لطیف صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کا دل اچھل کر حلق میں پھنس گیا ہے۔ نسیمہ کو
پہلو بہ پہلو لیے وہ اپنے کمرے میں پہنچے اور پہلی بات یہی کہی "اب آپ کی اجازت
سے آپ کی نقاب اُلٹنے کی گستاخی کرتا ہوں"

نسیمہ نے مزاحمت نہیں کی ... اور لطیف صاحب نے بصد شوق انگلیوں کی چٹکیوں
میں نقاب پکڑ کر اسے الٹ دیا۔

رات ... چاندنی میں نہائی ہوئی رات

ساڑھے گیارہ بج چکے تھے، میاں اور بیگم دونوں اپنے اپنے بستر پر سونے
کا حیلہ کیے پڑے تھے لیکن دراصل دونوں جاگ رہے تھے، ہر طرف خاموشی
مسلط تھی، کمرے کی ہر چیز دم بخود۔ پھیکی چاندنی کھڑکی کے شیشوں سے چھن کر
دری پر مری پڑی تھی۔

لطیف صاحب دل ہی دل میں بولے "اچھا تو بیگم! یہ تم تھیں، کانونٹ میں

پڑھتی تھیں تو ڈرامے کھیلا کرتی تھیں آج وہی فن تمہارے کام آیا کن کن حیلوں سے آواز چھپائی، صورت چھپائی ۔۔۔ آپ کی اس اداکاری کا تو میں قائل ہو گیا لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ اپنے میاں سے جو بڑھاپے کے خاردار میدان میں داخل ہو چکا ہے اس قسم کا مذاق کیوں کیا ۔۔۔ کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ"

بیگم آنکھیں موندے پڑی تھیں ۔۔۔" عورت یا لوب کے لفظوں میں بیگم جب اپنے حسن و شباب کی قربانی دے چکتی ہے تو میاں کو زندگی کے خوشبو دار موڑ کی سوجھتی ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ میاں لوگ اس بات کی امید کیوں رکھتے ہیں کہ جس بیگم نے زندگی بھر قدم قدم پر ساتھ دیا وہ اس خوشبو دار موڑ پر ساتھ چھوڑ دے گی ۔؟

بچے دوسرے کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے اور ان کے خوابوں میں رنگ برنگی پریاں رقص کر رہی تھیں ۔

گن ہِل پر رم جھم

مسوری کی مال روڈ پر دو آدمی تار گارڈ ی، کو ٹھونک پیٹ کر اس قابل بنا رہے تھے کہ وہ سواریوں کو گن ہل تک لے جا سکے، اور پھر وہاں سے انہیں مال روڈ تک واپس پہونچا سکے، میں بھی تماشائیوں میں شامل تھی۔

مارچ کا مہینہ تھا، کلکڑی اور کتاب گھر، کی زیادہ تر دکانیں ابھی بند پڑی تھیں، سینما ہاؤس بھی نہیں کھلے تھے، اِس لیے کہ سیلانیوں کی یورش دراصل مئی کے آخری ہفتہ میں شروع ہوتی تھی۔ اِس آف سیزن (OFF SEASON) میں میرے جیسے کچھ سر پھرے سیلانی ہی سڑکیں ناپتے نظر آتے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے خاص سیزن کی بھیڑ بھاڑ، گہما گہمی، اور شور و شر قطعاً پسند نہیں ہے۔ اُن دنوں ہوٹلوں میں ایسی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے جیسے برسات کے موسم میں مینڈکوں کی بھرمار۔ آج کل یہ حال ہے کہ بس یا ٹیکسی سے اترتے ہی نہ جانے کتنے ہوٹلوں کے گائیڈ ہاتھ باندھے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ احساس کتنا خوش گوار ہوتا ہے کہ اس پردیس میں بھی آپ کو خوش آمدید کہنے والے موجود ہیں، کچھ دیر تک آپ اُن کی خوشامد، چاپلوسی اور چرب زبانی سے محفوظ ہو سکتی ہیں۔ اور جب آپ کسی ہوٹل میں پہونچتی ہیں تو کانوں میں غیر موجود چوب دار کی للکار سنائی دیتی ہے،

ہوشیار باش! خبردار! رضیہ سلطاں کی سواری آرہی ہے۔۔۔

سیر کو چلیے، سُنسان سڑکیں ناپیے جہاں جی چاہے بیٹھیے جس جگہ چاہیے، ٹہلیے۔۔۔ کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی نہیں، کوئی تاک جھانک کرنے والا نظر نہیں آتا۔۔۔ اُف! مرد کی سرشت کو کیا کہیے! مجھے محسوس ہوا کہ تماشائیوں میں سے ایک نوجوان ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ طبیعت حساس ہو تو مرد کی نظر کی حدت یوں محسوس ہونے لگتی ہے جیسے آتشی شیشے میں سے گزر کر ننگی جلد پر پڑنے والی سورج کی کرنیں۔ لیکن وہ شخص خاصہ مستعد نکلا، کیوں کہ جوں ہی میں نے اُس کی طرف دیکھا، اس نے فی البدیہہ رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

اس کی صورت کچھ مانوس سی محسوس ہوئی۔ یاد نہیں آرہا تھا کہ اسے کہاں اور کب دیکھا تھا۔۔۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کہیں یہ لاشعور کا کرشمہ تو نہیں ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے کبھی لاشعوری طور پر کسی سے بات کرنے کو جی چاہے تو آغازِ گفتگو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ۔۔۔ آپ کی شکل جانی پہچانی سی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا لاشعور اس نوجوان سے متعارف ہونا چاہتا تھا۔ اُف توبہ! ہندوستانی لڑکی چاہے کتنی بھی موڈ MOD بننے کی کوشش کرے وہ سیتا اور ساوتری کی چھاپ سے معرا ہو ہی نہیں سکتی بالخصوص اس صورت میں جب کہ اپنی زلفِ پُر پیچ میں کسی اور مرد کا دل آویزاں کر رکھا ہو۔ مانا وہ ہرجائی نکلا، لیکن دل کے نہاں خانوں میں اب بھی اسی کی ذات مستور تھی۔۔۔

میرا خیال آیا کہ میں وہاں کھڑی کھڑی کیا کر رہی تھی جب موڈ، آلتو فالتو، ہو رہا ہو تو انسان دیدہ و دانستہ اٹکتا لٹکتا چلتا ہے، کہیں ڈگڈگی بجتی دیکھی تو رک گئے، کہیں کسی صاحب بہادر ہینم چورن نے مجمع لگا رکھا ہے تو اٹک گئے، کہیں بھوٹانی متفرقات کی صف بچھی ہے تو ہر مال پر لگے آنکھیں پھوڑنے۔ یہی موڈ اس وقت ہو رہا تھا۔ تارگاڑی سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، مجمع دیکھا تو لٹک گئی، آخر گن ہل پیدل بھی جا سکتی تھی، راستہ بھی طویل نہیں تھا، کیا بدذوقی تھی کہ پہاڑوں کے نیچے کی جانب دون کی وادی پر نظر دوڑا کر کیف حاصل کرنے کے بجائے تارگاڑی کو تلکے جا رہی تھی۔

میں آگے بڑھ گئی، کچھ ہی فاصلہ پر چلڈرن پارک تھا۔ بچوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ اور وہ جو کبھی زچہ تھیں اب بچوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں البتہ آیا لوگ یا تو نبلیں کھا رہی تھیں یا اپنے تھنّے کرید رہی تھیں۔

وہاں پندرہ بیس منٹ تک رک کر میں نے محظوظ ہونے کی ناکام کوشش کی جب یہ احساس ہوا کہ خوش ہونے کے بجائے میں اوب رہی ہوں تو سوچا۔۔۔ اے دل، اب کہیں اور چل!

کچھ دور جا کر سڑک کے کنارے کسی فوٹوگرافر کی شو ونڈو (SHOW WINDOW) کے سامنے رک گئی۔ دس پندرہ منٹ فوٹو دیکھنے میں گزر گئے کھڑے کھڑے پیر تھک گئے تو جی چاہا کہیں بیٹھ کر چائے پی جائے مگر کہاں؛ تب اوپر گن ہل کو جانے کا خیال آیا جہاں ایک اچھا خاصا ریستوران تھا۔

ایک بار پھر راہ گم کردہ راہی کی طرح چل پڑی، کتاب گھر بازار سے

کافی اِدھر ایک راستہ گن بل کو جاتا تھا اسی پر ہو لی۔

اتنے میں گھاٹی سے بادلوں کا غول اوپر کو اُمڈ آیا، ہر طرف دھند چھا گئی، بوندا باندی ہونے لگی، آدھا راستہ طے کر چکی تو یکایک بارش تیز ہو گئی، آس پاس کی چیزیں بھی واضح طور پر نظر نہیں آتی تھیں، آگے بڑھنے کی ہمت چھوٹنے لگی، لیکن واپس جانے سے بھی کیا حاصل؟ اپنا چھوٹا سا چھاتہ آگے کو جھکا کر بڑھتی چلی گئی مگا پاؤں رپٹ گیا، تب مجھے احساس ہوا کہ میں اس راستہ کے بالکل سرے پر تھی، یہ سوچ کر گھبرا گئی کہ اگر سنبھل نہ پائی تو ایک پیر لازمی طور پر ٹوٹ جائے گا، میں سنبھل نہیں پا رہی تھی کہ اتنے میں کسی نے جھپٹ کر میرا بازو تھام لیا اور پھر مجھے اوپر کھینچ لیا۔

کون تھا میرا محسن؟ ۔۔۔ وہی جو تار گاڑی کے مجمع میں مجھے گھور رہا تھا، عجب فلمی اتفاق تھا یہ! پیر ٹوٹنے سے بچ گیا، لیکن یہ سوچ کر کوفت ہونے لگی کہ کس کے چنگل میں آ پھنسی!

اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "اُدھر چلیے! جب تک موسلا دھار بارش ہے وہاں پناہ مل جائے گی" یہ کہہ کر وہ چل دیا، بمجبوراً مجھے بھی اس کی رائے ماننی پڑی، میں پیر تڑوانے کا نیا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھی۔

بڑے بڑے بے ڈول پتھروں کی ایک ہی قطار میں چند کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں، جن کے آگے ایک طویل برآمدہ تھا، یہ کوٹھریاں غالباً سامنے والے بنگلہ کے مالک کے نوکروں کے لیے بنائی گئی تھیں، حالاں کہ اس وقت وہاں ہمارے سوا کوئی نہ تھا۔

اس نوجوان نے مڑ کر میری طرف دیکھا تک نہیں، وہ کچھ فاصلہ پر میری طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھگوان کا شکر کیا اور ادھر والے گوشہ میں کھڑی ہو کر دھندلے پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔

کبھی کبھی میں دزدیدہ نگاہ اس پر بھی ڈال لیتی تھی کہ کہیں وہ میری طرف دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ لیکن وہ اسی طرح کھڑا تھا۔ اس نے برساتی پہن رکھی تھی سر ننگا تھا اور پاؤں میں گم بوٹ تھے۔

کچھ منٹ گزر گئے۔ رفتہ رفتہ بارش دھیمی ہونے لگی۔ میں نے سوچا، شاید اب وہ ضرور مجھ سے کچھ کہے گا۔ لیکن وہ کچھ نہ بولا۔

جب بارش نے خوش گوار پھوار کی حالت اختیار کر لی تو وہ پلٹا۔ میں سنبھلی لیکن وہ ایک فراٹے سے میرے قریب سے ہو کر پتھریلے راستہ پر پہونچا اور پھر گن ہل کی طرف چڑھنے لگا۔

مجھے بہت برا لگا۔ بدتمیز کہیں کا! اپنے آپ کو نہ جانے کہاں کا دھرمیندر یا امیتابھ سمجھتا تھا۔ میں بھی برآمدے سے اتری۔ دل میں آیا، واپس چلی جاؤں۔ پھر طیش میں آکر سوچا میں اس مردود سے ڈرتی ہوں کیا!

اوپر پہونچی تو سامنے گن ہل کا میدان پھیلا ہوا تھا۔ جس کے پرے کنارے پر ایک حجرہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے دائیں ہاتھ کو تار گاڑی کا اڈہ تھا۔ اور اڈے سے بھی پہلے ریسٹورانٹ تھا۔ ہموار میدان میں سردی کی شدت اور بھی بڑھ گئی تھی کیونکہ چاروں طرف سے آنے والی ہواؤں کے آگے کوئی روک نہیں تھی۔ ٹھنڈک کے احساس سے گرم گرم چائے کی طلب اور بھی بڑھ گئی۔

ریستوراں تک پہونچی تو دیکھا، میراحسن دروازے میں اندر کی طرف منھ کئے کھڑا ہے۔ پہلے تو ٹھٹکی، پھر یہ سوچ کر آگے بڑھ گئی کہ آخر اس میں ہچکچانے کی بات ہی کیا ہے۔

اس کے پہلو تک پہونچی تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا، "سارا ریستوراں بھرا پڑا ہے صرف ایک میز خالی ہے، میرے خیال میں آپ ہی وہاں بیٹھ جائیے۔۔ تھوڑی دیر میں کوئی اور میز خالی ہو ہی جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ لوٹا اور میرے پہلو سے نکل کر باہر چل دیا۔

کسی اضطراری کیفیت کے تحت میں نے آواز دی "سنیئے۔"

وہ رکا، میں نے پھر کہا "مجبوری ہے، جب تک کوئی اور میز خالی نہیں ہو جاتی ایک ہی میز پر بیٹھنے میں کیا حرج ہے!"

اس کے چہرے سے کسی بھی کیفیت کا اظہار نہ ہوا اس نے بے اعتنائی سے اپنے کندھوں کو حرکت دی اور خالی میز کی طرف بڑھ گیا۔

میں اس کے مقابل والی کرسی کے قریب کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے کیوں اس کے ساتھ ایک ہی میز پر چائے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، کھڑکی سے باہر پھوار کا منظر دیکھنے لگی۔

بیرا آیا تو اس نے کہا "چائے۔"

تھوڑی دیر بعد بیرا چائے کے دو پیالے میز پر رکھ کر چلا گیا، میں نے سوچا اب تو چائے زہر مار کرنی ہی پڑے گی پہلے میں اسے دل پھینک انسان سمجھی تھی، اب وہ مجھے بہت بدتمیز، بے ہودہ، اور غیر مہذب انسان معلوم ہو رہا

کرسی پر بیٹھتے ہی میں نے دیکھا اس نے پیالے کے کنڈے میں انگلی نہیں ڈالی، کنڈے ہی کو پکڑ کر پیالہ اٹھایا۔ آدابِ نفاست کے لحاظ سے یہ اچھی بات تھی۔

جس جگہ اتنی بڑی تعداد میں لوگ بیٹھے ہوں وہاں یہ تو ناممکن تھا کہ ان کی نگاہیں کسی نوجوان خوبرو لڑکی کی طرف نہ اٹھیں۔ مجھے ایک بے حس انسان کے مقابل چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر وہ نہ جانے کیا سوچنے لگیں آخر ایسی بھی فرعونیت کیا؟ اندر ہی اندر میں کھولنے لگی۔ نہ رہا گیا تو میں نے بے ساختہ کہا
کیا آپ آج گھر سے خودکشی کا تہیہ کر کے نکلے تھے؟
اُس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ بولا "میں سمجھا شاید آپ کسی اجنبی مرد سے گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھیں"۔
"اجنبی مرد کیا، میرا تو مرد ذات ہی پر سے اعتبار اٹھ چکا ہے"۔
"معاف کیجئے! آپ کا نظریہ بہت بوسیدہ اور گھسا پٹا ہے"۔

اس طرح گفتگو کا آغاز ہوا، اور پھر ہمارے درمیان فضا کسی قدر خوشگوار ہو گئی۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی اجنبی جگہ پر کسی اجنبی سے ہم بعض ایسی نجی باتیں بھی کہہ ڈالتے ہیں جو عام حالات میں اپنوں سے کہنے میں تامل ہوتا ہے مرد ذات سے اعتبار اٹھ جانے کی وضاحت کے سلسلہ میں دل کی بات زبان پر آ گئی۔

اُس نے بہت سنجیدگی سے کہا "آپ جیسے چاہتی تھیں اُسے کسی اجنبی لڑکی

کے ساتھ دیکھا تو اس سے ناطہ توڑ لیا اور اس سے شادی کا خیال بھی ترک کر دیا یہاں تک کہ مرد ذات سے آپ کا اعتبار ہی اُٹھ گیا۔۔۔۔ معاف کیجیے! دیکھنے میں تو آپ اتنی احمق اور سادہ لوح نہیں معلوم ہوتیں آپ نے جواب تو طلب کیا ہوتا اس سے کہ اس کے ساتھ وہ اجنبی لڑکی کون تھی؟"

یہ سن کر میرے دل میں تلاطم سا پیدا ہو گیا۔ واقعی کتنی طفلانہ حرکت سرزد ہوئی تھی مجھ سے خود کو اس حقیقت کا احساس نہیں ہوا لیکن کسی دوسرے کے توجہ دلانے سے جیسے حقیقت آئینہ ہو گئی۔ اس لیے جلنے کے تحت میں پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی کے باہر جھانکنے لگی۔ سوچنے لگی کہ محبت بھی ایک طرح سے احمقانہ عمل ہے جبھی تو اسے دماغ کا خلل کہا گیا ہے۔ اس کے زیر اثر اچھا خاصا انسان ذلیل حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ میں جذبات کی رَو میں اس شدت سے بہہ نکلی کہ باہمی تعلقات میں توازن بھی قائم نہ رکھ سکی۔

اب لوگ تار گاڑی پر بیٹھنے لگے تھے۔ غالباً گاڑی درست ہو گئی تھی، میں نے پرس میں سے چھوٹی سی دوربین نکالی اور اسے آنکھوں سے لگا کر تار گاڑی کو دیکھنے لگی۔ دفعاً میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "ملا منوج!"

ادھر میرے "ہم پیالہ" کی آواز سنائی دی۔ "ایک میز خالی ہو گئی ہے، میں وہاں جا رہا ہوں۔"

میں فوراً پلٹ کر بولی "معاف کیجیے میں باہر جا رہی ہوں آپ یہیں تشریف رکھیے۔"

کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے چائے کے پیسے ادا کرنے کے لیے میں نے پرس کھولا

تو میرا" ہم پیالہ" پھر بولا" اس کی چند ساعت کیجیے۔ میں نے بل ادا کر دیا ہے۔"

اب میں رک نہیں سکتی تھی، کچھ اور کہے بغیر میں ریستوران سے باہر نکلی اور آگے بڑھ گئی۔ تار گاڑی اوپر پہنچی تو مسافر اترنے لگے۔ میں دیدہ و دانستہ یوں لپکی جیسے گاڑی پر سوار ہونے کی جلدی میں ہوں۔

اسی دوران منوج نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "سنو!"

میں نے انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا" ارے تم؟"

"معاف کرنا میں ذرا جلدی میں ہوں۔"

اس نے میرے کندھے پر اپنی گرفت ذرا مضبوط کرتے ہوئے کہا "معاف کرنا، ابھی میں تمہیں جانے نہیں دونگا۔ میں تم سے بھی زیادہ جلدی میں ہوں!"

میں رک گئی۔ رکنا چاہتی بھی تھی۔

اڈے سے نکل کر ہم ذرا فاصلہ پر حجرے کی طرف بڑھے۔ پھوار اب بھی لگاتار گر رہی تھی۔

جب ہم چھت کے نیچے پہونچ گئے تو میں نے اس سے آنکھ ملائے بغیر جیسے اقبالِ جرم کرتے ہوئے کہا" میں نادم ہوں منوج۔ محض ایک بار کسی لڑکی کے ساتھ تمہیں دیکھ کر مجھے اتنی جلدی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئیے تھا، میرا فرض تھا کہ میں تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ تو دیتی۔"

"اوہ! تم اتنی سمجھدار کب سے ہو گئیں! خیر! تم نے تو مجھے موقعہ نہیں دیا، لیکن میں تمہیں صفائی پیش کرنے کا پورا پورا موقعہ دونگا۔"

چونک کر میں نے اس کی طرف دیکھا، "کس بات کی صفائی؟"

اس نے گھور کر میری طرف دیکھا اور غرّا کر بولا "یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تم نے غیر مرد کو اپنے بازو میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت کیوں دی ؟"

"اوہو! جب میں گن ہل کو آ رہی تھی کہ یہ حضرات میرا پیچھا کر رہے تھے"۔ میں نے جواب دیا "میں پھسل گئی تھی، اس نے مجھے صرف سہارا دیا۔ یہ سب اچانک ہوا۔ ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔"

"خوب! لیکن میں جان سکتا ہوں کہ اس کے بعد تم سیدھا راستہ چھوڑ کر اس اجنبی کے ساتھ کہاں چلی گئی تھیں ؟"

یہ کھلم کھلا الزام سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اب تو اپنی صفائی میں میرے منہ سے الفاظ کا لاوا بہہ نکلا۔

منوج نرم پڑ کر بولا "چھوڑو ان باتوں کو۔ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔ آؤ! سامنے والے ریستوران میں چلیں۔"

میں نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا "وہاں جانا ضروری ہے؟ کہیں اور کیوں نہ چلیں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا "اس لیے کہ وہاں وہی نوجوان بیٹھا ہے!"

میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ گلوگیر آواز میں بولا "تمہیں اب بھی اعتبار نہیں آیا؟"

وہ ہنس کر بولا "میں تم پر یقین کرتا ہوں کیونکہ ..... وہ تمہارا دیور

ہے۔"

"مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں وہیں گر پڑوں گی۔ تو یہ وہی امریکہ والا بھولا بھائی ہے تمہارا، جس کا تم اکثر ذکر کیا کرتے تھے؟"

"ہاں۔"

"تم دونوں بڑے سازشی نکلے، میرا پیچھا کرتے ہوئے مسوری چلے آئے!"

میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

وہ بولا۔" دیکھو اُدھر پھوار گر رہی ہے، اِدھر تمہاری آنکھوں میں رم جھم کا سماں بندھا ہے۔"

میں نے آنسوؤں کی چلمن میں سے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

اس نے میری پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا" اب تو تمہیں وہاں چلنے میں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے!"

چپ چاپ میں اس کے ساتھ چلی۔ ریستوران کے دروازے پر پہنچنے سے پہلے وہ رکا اور کہنے لگا" ارے ہاں! اپنی صفائی پیش کرنا تو میں بھول ہی گیا۔۔۔ وہ لڑکی جو تم نے میرے ساتھ دیکھی تھی وہ تمہارے دیور کی منگیتر ہے یاد ہے! میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ صرف شادی کی خاطر کچھ دنوں کے لیے انڈیا آرہا ہے۔"

گھر کا راستہ

"بابا! آپ اندھے ہیں کیا؟"

یہ سوال کرنے والی آٹھ برس کی بچّی تھی، اُس نے چمکدار پھولوں والا رنگین فراک پہن رکھا تھا، چھوٹے چھوٹے چمکتے ہوئے کالے بوٹوں میں سے نکل کر سفید موٹی گداز پنڈلیوں کو چھو رہے تھے، اس کی موٹی سرمگیں آنکھوں میں تجسس کی جھلک تھی، اور گورے گلابی چہرے سے معصومیت ٹپکتی تھی۔

بچی جتنی خوش پوش تھی، بابا کے کپڑے اتنے ہی بدنما تھے۔ اس کا کوٹ چرمرایا ہوا تھا اور پتلون کی صرف کریز ہی غائب نہ تھی، وہ پائجامہ سے بھی بدتر معلوم ہو رہی تھی، چہرے پر جھرّیوں کا جال بچھا ہوا تھا، وہ نابینا نہیں تھا، البتہ اس کی آنکھیں کچھ پیلی اور گدلی تھیں اور ان میں نور کی دمک کا شائبہ تک نہ تھا۔

اس نے جھک کر نیچے کی طرف دیکھا، بچّی کی آواز میں اُسے ہمدردی کا احساس ہوا اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بچی نے دوسرا سوال کر ڈالا "کیا آپ اپنے گھر کا راستہ بھول گئے ہیں؟"

"ہاں بیٹا!" میں راستہ بھول گیا ہوں گھر کا۔"

اُسے اتنا تو یاد تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی گھر ضرور تھا، ورنہ راستہ بھول جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ دماغ دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔ ابھی تک اُس نے

گھر کا راستہ بھول جانے کو زیادہ اہمیت نہ دی تھی لیکن بچی نے اُسے اس بات کا احساس دلا دیا۔

"تو اس میں پریشانی کی بات کیا ہے، چلو! میں تمہیں گھر تک پہنچا دوں۔"

اُس نے بچی کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، یا پھر اس کی صورت اُس کے ذہن سے اتر چکی تھی، وہ اسے پہچان نہ پایا۔ غالباً وہ اُس کے پڑوس میں رہتی ہوگی، وہ اسے اکثر کھانس کر ٹہلتے ہوئے دیکھتی ہوگی، اُس کے چہرے سے خود اعتمادی ٹپکتی تھی ..... بلاشبہ وہ اسے جانتی ہوگی۔ اور اسے گھر تک پہنچا دے گی۔

"بیٹی! تمہارا نام کیا ہے؟"

"بے بی۔"

بچی کی سادگی پر اسے پیار آنے لگا۔ بے بی کے اصلی نام کی جستجو بے سود تھی، ہو سکتا ہے اس کے پھر پوچھنے پر بے بی کہہ اٹھے "تو کیا آپ یہ بھی بھول گئے کہ بے بی کون ہے!"

بے بی نے سر کے ایک ہی جھٹکے سے لوب طرز کے کٹے ہوئے اپنے گھنے بالوں کو پیچھے کی طرف پھینک دیا۔ اُس کے کندھے بالکل سیدھے تھے اور اس کا سپاٹ سینہ تنا ہوا تھا، وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی رقاصہ شادان گڈیا سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے پاؤں پھولوں کے سے سبک انداز سے زمین کو چھو رہے تھے، وہ زمین کی سطح پر تیرتی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔

اس نے بے بی کے پاؤں پر نظر جما دی ..... وہ پاؤں جو جوتوں سے بے نیاز،

گزرے تھے اس شاہ راہ پر بے شمار پاؤں ان گنت جوتے رواں دواں تھے،
جوتے بھی کئی رنگوں اور کئی ڈیزائنوں کے تھے۔ عجب بہار تھی ان جوتوں کی۔
کچھ دیر بعد ان جوتوں کے ہجوم میں بلی کا پتہ نہ تھا، یا وہ آگے نکل گئی
تھی یا پیچھے رہ گئی تھی،

اس نے رکنے کی کوشش کی، لیکن انسانوں کے اس بہاؤ میں ایک
جگہ پر رکے رہنا بھی اس کے لیے ناممکن تھا،

انسانوں کے تیز و تند ریلے میں وہ تنکے کی طرح بہا چلا جا رہا تھا،

آسمان پر سورج چمک رہا تھا لیکن ایک طرف سے ایک بڑا سا کالا بادل
ریچھ کی طرح منہ اٹھائے اس کی طرف بڑھ رہا تھا، چشم زدن میں سورج اس
کے کھلے ہوئے منہ میں آگیا، تمازت کی جگہ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی گھل مل گئی،

وہ بھیڑ بھاڑ میں سے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اس کی جسمانی
قوت اسکا ساتھ نہیں دے رہی تھی، وہ گر پڑا گیا،

اسی وقت اسے ایک چہکتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہائی ڈیئنش!"

پھر "مردانہ آواز" ہائی ہونی!

اس نے دائیں طرف رنگین کرتہ اور غرارے اور پائجامے جیسی بڑی
موہری والی پتلون زیب تن کیے دیشنہ باز نوجوان کو کھڑے پایا، جس کی نظر اس
کے بائیں جانب کھڑی ایک لڑکی پر جمی ہوئی تھی جو بیل باٹم میں ملبوس اپنی نیم
آنکھوں پر چشمہ چڑھائے تھی، چشمے کے شیشے چھوٹی طشتری سے چھوٹے
نہ تھے۔

اُن نوجوانوں نے ایک اولڈ مین کو اپنے درمیان حائل ہوتا دیکھ کر اضمحلال کا اظہار کیا، پھر ہائی ذنیش، نے اپنے منہ کے دہانے کو اس کان سے اس کان تک کھینچتے ہوئے کہا "زحمت نہ ہو تو راستہ چھوڑ دیں۔"

اولڈ مین ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ بھی نہ پوچھ بیٹھیں کہ آپ اندھے تو نہیں؟ اس لیے اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "میں اس بھیڑ میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔"

ہائی موتی بولی "پُور اولڈ فیلو! — چلو ذنیش اس کو بھیڑ سے باہر کر دیں۔"

ذنیش نے اس کا بازو تھام لیا اور دوسرے ہاتھ میں موتی کا ہاتھ لے لیا۔ وہ دونوں مشہور اداکارہ جان جہاں کی اچانک موت پر اظہارِ تاسف کر رہے تھے۔

درمیانی بہاؤ سے باہر بھی بیشمار انسان رنگین کپڑے مکوڑوں کی طرح اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر ذنیش اپنے چہرے پر مردانہ تیور پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "آپ کو جانا کہاں ہے؟"

"میں گھر کا راستہ بھول گیا ہوں۔ نسیان کا مریض ہوں۔ پل بھر پہلے کی بات بھی بعض اوقات یاد نہیں رہتی۔ بازار میں کھڑا ہوں، خریدار نہیں ہوں۔"

یہ بہکی بہکی باتیں سن کر موتی نے اپنے سر پر پتلی انگلی رکھی اور اسے پیچ کس کی طرح گھما کر اپنے ساتھی کو سمجھایا کہ اولڈ فیلو کے دماغ کا کوئی پیچ یقیناً ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ اور پھر بلند آواز سے بولا "کیوں نہ ہم انہیں انکے گھر تک پہنچا دیں۔"

"ہاں! ہاں!"

نئے خضرِ راہ پاکر اولڈ فیلو ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا،

سورج ایک بار تو ریچھ نما بادل کے منہ سے نکل آیا تھا لیکن پورب کی جانب سے جھوم کر امڈتی گھٹا کے تیور خطرناک دکھائی دے رہے تھے،

دھوپ کی شدت سے بھرے ہوئے تمتا رہے تھے۔ نہ جانے کتنے چہرے.. کالے، سانولے، گورے، اور بدن! نہ جانے کتنے جوان بدن... ڈھیلے ڈھالے کرتوں میں تھرکتی گولائیاں... گداز کولہے،

اپنی دانست میں وہ نوجوان جوڑے کے پیچھے پیچھے چلا جارہا تھا، چلتے چلتے اس نے محسوس کیا اس کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں پھر محسوس ہوا جیسے وہ گرنے کو ہو اور شاید وہ گر ہی جاتا اگر اسے آگے بڑھ کر کوئی تھام نہ لیتا۔

اسے بڑے بڑے پیلے دانتوں کی جھلک نظر آئی، ادھیڑ آدمی کا چہرہ اس کے سامنے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کاٹھ کا بنا ہوا ہو لیکن وہ کاٹھ کا الّو نہیں تھا۔ تیور بتاتے تھے، کہ وہ ماڈرن ٹائپ کا سیٹھ تھا، وہ کلین شیوڈ تھا لیکن چہرے پر کالی راکھ ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی، غالباً اس کی داڑھی کے بال موٹے اور گھنے تھے، اس کے دانشگاف نتھنوں میں بھی بالوں کا جنگل سا نظر آرہا تھا، گاگز ہاتھ میں تھامے وہ بے حد تجسس سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، اسے مزید کسی کی تلاش تھی، یا وہ کسی کا منتظر تھا،

ان دونوں کی بات چیت بھی ہوئی، سیٹھ نما جنٹلمین نے بار بار رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا،

”میری کار رکھڑی ہے، بس ابھی چلتے ہیں، چنتا کی کوئی بات نہیں

'بابا' جی بھی اطمینان سے ایک دیوار یا بنگلے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ چلچلاتی دھوپ ہیں۔ ایک طویل کار سڑک کے کنارے کھڑی دھول پھانک رہی تھی، کار کو کچھ دیر دیکھتے رہنے سے اس کی طبیعت اوب گئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں، تاکہ ان کی تکان ذرا دور ہو جائے۔

نہ جانے وہ کتنی دیر تک اونگھتا رہا۔ جب چونک کر اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے سامنے ایک پوپلی سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ پہلے تو وہ سمجھا وہ آئینہ میں اپنی ہی صورت دیکھ رہا ہے۔ لیکن یہ غلط فہمی دوسرے ہی لمحہ دور ہو گئی۔ وہ اس کا ہم عمر کوئی اور تھا۔ مرد۔ کار والا۔ غالباً اسے اونگھتا دیکھ کر رخصت ہو گیا۔

دونوں کی بجھی بجھی آنکھیں ایک دوسرے سے ملیں۔ نووارد نے کہا "پہلے تو بھیڑ بھاڑ میں سے نکلنا چاہیئے مہاراج!"

بھیڑ میں سے نکل کر دونوں کی پوپلی پوپلی باتیں شروع ہو گئیں، اپنے ہم عمر سے باتیں کرکے مہاراج کو یک گونہ تسکین کا احساس ہوا تے ساتھی نے کہا "تو کیا ہوا؟ فی الحال آپ میرے گھر چلیے نا!"

وہ اس پر بھی تیار ہو گیا۔ گھر تھا سے اپنا نہ سہی، دوسرے کا سہی بے در و دیوار تو نہ ہوگا، ورنہ گھر کیسا!

آسمان پر بادلوں کا کارواں۔۔۔ جیسے ریچھوں کا کارواں کہنا چاہیے۔ پڑے زور سے چنگھاڑتا ہوا سورج پر چڑھ دوڑا۔ آفتاب عالمتاب

کی حالت عذبِ آفتاب سے بھی بدتر ہو گئی، رُخِ روشن پر تہہ در تہہ دبیز پردے گرنے لگے۔

چلتے چلتے نووارد رک گیا، پھل والے بوڑھے نے پوچھا "کیا ہوا ہے؟"

"وہی جو آپ کو پہلے ہی سے ہو چکا ہے"

یہ سن کر بوڑھا دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ ہونٹ نسیان زدہ ہونے کے سبب مسکراہٹ کا بار برداشت کرنے سے قاصر تھے۔۔۔ تو یہ حضرت بھی اپنے گھر کا راستہ نہیں جانتے؟ یا بھول گئے، یا انہیں غلط فہمی تھی کہ وہ راستہ سے واقف ہیں۔

فضاؤں میں تہلکہ مچا ہوا تھا، پرزور ہوا کے جھونکوں سے پاؤں اکھڑے جا رہے تھے۔

بارش کا آغاز ہونے ہی کو تھا۔

نووارد نے اپنی میلی پتلون کی جیب ٹٹول کر مڑی تڑی سے سگریٹ نکالے اور ایک اپنے ساتھی کی طرف بڑھایا۔ دونوں کے چہرے چھوہارے کی طرح خشک اور سکڑے ہوئے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ان کے منہ سے دھواں نکلنے لگا، جیسے بوسیدہ قبر کے روزن سے نکل رہا ہو۔

بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں، لوگ تتر بتر ہونے لگے۔ ان گنت زلفیں لہرائیں، رنگ برنگے کرتے اور زیربند ہوا میں پھڑپھڑانے۔ "ادئی! ادئی!" کا شور تھا کہ ترنم کا سمندر!

وہ دونوں تپلی پتلی ٹانگوں کو ادھر ادھر پھینکتے ہوئے بے ڈھنگے انداز سے بھاگے۔

سڑک کے اس پار زمین کا ایک ایسا ٹکڑا تھا جس پر زنگ خوردہ لوہے کی چادریں سایہ فگن تھیں۔ کبھی یہ بس کا اڈہ تھا۔ لوگ یہاں 'کیو' بنا کر کھڑے ہو جاتے، اپنی بس کا انتظار کرتے۔ جب بس آتی تو اچک کر اس میں بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے گھر کو روانہ ہو جاتے۔ لیکن اب یہ اڈہ سنسان پڑا تھا۔ وہاں کوئی بس نہ رکتی تھی۔ کوئی سواری بس کا انتظار نہ کرتی تھی۔

وہاں پہنچتے پہنچتے تیز بارش ہونے لگی۔ گیلی سڑکوں پر تیزی سے تھرکتی ہوئی رنگین کاریں جل پریاں سی معلوم ہو رہی تھیں۔

وہ دونوں بس کے پرانے اڈے پر پہنچ گئے۔ جہاں ایک بوسیدہ بنچ بچھی تھی، جس پر وہ بیٹھ سکتے تھے۔ اور زنگ خوردہ آہنی چادروں کے نیچے بارش کی بوچھاڑ سے بچ سکتے تھے۔

جتنی تیزی سے بارش کا ریلا آیا تھا اتنی ہی تیزی سے چلا بھی گیا۔ لیکن اتنے ہی میں ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔

وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب تک ان کے دماغ گھر کے معاملے میں جیسے طاق نسیاں ہی پر رکھے تھے۔ اتنے میں سامنے سے ایک بچہ گاڑی آتی دکھائی دی۔ آیا سوکھی لکڑی سی معلوم ہوتی تھی۔ اور بچے کا چہرہ تھا، ہلکے پھلکے کپڑوں میں لپٹا ہوا ٹماٹر۔

انہوں نے جھک کر بچے پر نظر ڈالی تو اس کے ننھے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس کی اس مسکراہٹ میں ایسی طمانیت اور نور اغماز تھی جیسے وہ

ازل سے ابد تک کے سبھی راستوں سے بخوبی واقف ہو، شاید تھا بھی!

شکریہ

مالا

میں میرامینشن کی شاندار بلڈنگ کے آگے سڑک پر کھڑی تھی۔۔۔۔
بلڈنگ کی نچلی منزل سے لے کر اوپر تک الگ الگ کمپنیوں کے دفتر تھے جن
کے سائن بورڈ آسانی سے پڑھے جا سکتے تھے۔ مجھے ایم۔ کے۔ لال اینڈ سنز
کے دفتر میں جانا تھا۔

سوچا تھا کہ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچ جاؤں گی، لیکن جب دور ہی سے
لفٹ میں دو مرد دکھائی دیئے تو ارادہ بدلنا پڑا۔ اور اونچی ایڑیوں کو کٹ
کٹاتی میں زینہ سے اوپر چڑھنے لگی۔

گیارہ جولائی کا دن تھا جس کے سبب جسم پسینہ سے تر ہو رہا تھا۔ زینہ
پر چڑھنا پڑا تو پسینہ اور بھی تیزی سے بہہ نکلا۔ دفتر کے دروازے کے قریب پہنچ کر
رک گئی تاکہ دم بھی لے لوں اور پسینہ بھی قدرے خشک ہو جائے۔

گھڑی دو گھڑی کے بعد بڑے دروازے کو دھکیل کر اندر پہونچی تو ایک
طول و عریض ہال میں کئی میزیں نظر آئیں جن کے نزدیک کرسیوں پر بیٹھے بابو
صاحبان اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ داہنے کونے میں پوچھ تاچھ کی
تختی آویزاں تھی۔ وہاں پرانی پیڑھی کے ایک بزرگ بابو صاحب براجمان تھے۔
میں نے مینیجر کا نام لے کر پوچھا "ساہنی صاحب کہاں ملیں گے؟"
ان کو غالباً اونچا سنائی دیتا تھا۔ کان کے پیچھے ہاتھ کا پیمانہ سا بنا کر انہوں

نے گردن آگے بڑھائی، ایک آنکھ سکیڑ لی، اور نیم وا منھ سے میرے آنے کا سبب پوچھا۔

میں نے اپنی بات دہرائی تو وہ ایک چٹ اور پنسل سنبھال کر بولے۔

"شاہی صاحب نے آپ کو بلایا تھا کیا؟"

"جی"

"آپ کا شبھ نام؟"

"مالا"

چپڑاسی کو چٹ دے کر انہوں نے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گئی، منیجر کے کیبن کی چھت اور دیواروں پر ٹیک وڈ لگی تھی، فرش پر دبیز نمدہ بچھا تھا۔۔۔۔ ائیر کنڈیشننگ کی وجہ سے فضا خنک تھی میں خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگی، اور چپ چاپ نوجوان منیجر کو دیکھتی رہی، جو میری فائل کے کاغذوں کو الٹ پلٹ رہا تھا، وہ مجھ سے کئی سوال کر چکا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر بوریت کے آثار نظر آنے لگے۔ اور پھر اس نے فائل کو اتنی قطعیت کے ساتھ بند کر دیا جیسے کبھی آئندہ اسے کھولنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ جب اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہ نوکری ہرگز نہ مل سکے گی۔ سوچنے لگی کہ مرد جب کسی عورت کو ملازمت دینا چاہتا ہے تو اس کی شکل و صورت کو ضرور پرکھتا ہے۔ چاہے مدعا کچھ بھی نہ ہو۔ میں پری زاد نہیں تھی، قبول صورت تھی۔ علاوہ ازیں مجھے کپڑوں کے رنگوں کے میچ ملانے اور انہیں پہننے کا سلیقہ بھی نہ تھا۔ میرے دل میں بے

تکلفی نہیں تھی۔ اور نہ ہی دم بازی ۔۔۔۔ FLIRTATION پسند کرتی تھی، آخر تو
میں شادی شدہ عورت تھی، شوہر کی آمدنی سے اخراجات تو پورے ہو جاتے تھے،
لیکن نئے زمانے کی ضرورتیں اسقدر بڑھ گئی ہیں کہ میرے لیے نوکری کرنے کے
سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

ساہی صاحب نے اُدبلے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا:

"تو آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

"جی"

"دو بچے بھی ہیں؟"

"جی وہ دونوں اسکول جانے لگے ہیں۔"

کیسے بے تکے سوالات تھے! مطلب تو یہ تھا کہ میں دفتری کام کو اچھی طرح
نباہ سکوں، بھلا ان سوالوں کیسے کیا حاصل؟

ساہی صاحب فائل میری طرف بڑھا چکے تھے۔ میں نے جو ان کی زبان
سے انکار سننے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا۔ دل کو اس بات کا دکھ بھی تھا
کیونکہ ملازمت حاصل کرنا، میرے لیے بے حد ضروری تھا۔

ساہی صاحب مجھ سے کم از کم چھ سال چھوٹے تھے۔ مشکل سے چھبیس سال
کے، باپ کا ذاتی کاروبار تھا، اس لیے مینیجر بنے بیٹھے تھے، ورنہ کمپٹیشن کے اس
زمانے میں نوکری تلاش کرنا پڑتی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔ مجھے محسوس
ہوا کہ انہیں میرا نام تک پسند نہ تھا، حالانکہ میں کشش بھی کیا ہے! شاید وہ سوچ
رہے تھے، کہ مجھے کورا جواب دینے کے لیے کون سے الفاظ مناسب رہیں گے۔

معاً انہیں کسی بات کا خیال آیا بولے : "آپ کچھ ہی دیر پہلے اس لمبی سی مرسیڈیز کار میں سے اتری تھیں نا؟ "

"جی ہاں ۔"

"اتفاق سے اس وقت میں برآمدے میں کھڑا باہر کی طرف جھانک رہا تھا۔"

"اوہ!"

انہوں نے قدرِ تجسس سے اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے پھر دریافت کیا، "گھنگھریالے بالوں والی وہ لڑکی جو کار چلا رہی تھی، کون تھی ؟ "

لمحہ بھر کو میں تذبذب میں پڑ گئی ۔ لیکن انہیں اسقدر متجسس پا کر میں نے جواب دیا "وہ میری بہن تھی..... کزن ! یعنی میرے چاچا کی لڑکی ۔"

ساہنی صاحب کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ بولے۔" دور سے تو وہ کافی حسین لگ رہی تھیں ۔"

"جی ! نزدیک سے دیکھنے پر بھی وہ بیحد حسین دکھائی دیتی ہے ۔"

اب میں نے اپنی فائل واپس لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو انہوں نے فوراً ہی اس پر اپنا پنجہ رکھ دیا اور بولے ۔" آپ ایسا کیجیے کہ کل سے اپنے کام پر آجائیے ۔"

گِنّی

سنا تیس اگست کا ذکر ہے ۔ میں چنڈی گڑھ کے روز گارڈن میں بیٹھی تھی ۔ قریب پچپن تیس فٹ پرے ایک چھوٹی سی دکان سے فریج میں رکھی

ٹھنڈی اور میٹھی لسی والا پلاسٹک کا لفافہ لے کر میں نے اس جگہ اخبار کا ایک کاغذ گھاس پہ بچھایا اور اس پر بیٹھ گئی۔ دوکان کے نوکر نے پہلے سے ہی لفافہ کا کونا بلیڈ سے کاٹ کر ایک اسٹرا STRAW اسمیں ڈال دیا تھا، ٹھنڈی لسی دھیرے دھیرے چسکنے میں بڑا مزا آرہا تھا، دل کو فرحت حاصل ہورہی تھی، اور آنکھوں کو طراوت، میری نظر کسل مندانہ انداز سے پورے باغ کا جائزہ لے رہی تھی، زمین کا یہ قطعہ ہموار نہیں تھا بلکہ اوبڑ کھابڑ تھا، اسی لیے اسمیں قدرتی حسن کی جھلک نظر آتی تھی، گلاب کے پھول تو تھے ہی، لیکن ہری بھری گھاس اور جھاڑیوں نما پیڑ الگ بہار دکھا رہے تھے، پیڑوں کے اس پار فوارے کی اکلوتی دھار جھوم کر گویا آسمان کو چھونے کی امکان بھر کوشش کرتی، اور پھر سرنگوں ہوکر تالاب کے پانی میں جا گرتی، جس جگہ میں بیٹھی تھی وہاں سے پانی کی محض کمان ہی نظر آتی تھی،

اسطرح گھومتی ہوئی میری نظر پھر لسی والی دکان پہ جا پہنچی، اور وہیں رک کر رہ گئی، سبب؟

میں بہت حسین تھی۔ یہ میرا حسن ظن نہیں تھا اور نہ میں آئینے کے بہکاؤ کا شکار تھی، یہ تو خلقِ خدا کا فرمان تھا۔ چنانچہ مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوتا جب میں دیکھتی کہ مرد خصوصاً نوجوان میرے ایک آدھ جلوے پہ دل تھام کر رہ جاتے ..... مگر اس وقت میں ایک عورت کو اپنی طرف عاشقانہ نظر سے متوجہ پاکر دم بخود ہو کر رہ گئی،

خیر! میں نے تجاہلِ عارفانہ سے خود کو از سرِ نو باغ کے گوناگوں جلووں

میں کھو دینے کی کوشش کی، مگر اس دوران یہ احساس بھی تازہ رہا کہ وہ عورت مجھے مسلسل گھورے جا رہی ہے۔ بے اختیار ہی میری آنکھیں اس کی آنکھوں سے جا ٹکرائیں۔ اب تک وہ دیوار سے ٹیک لگائے لسّی چک رہی تھی، دوبارہ نظریں ملتے ہی وہ میری طرف بڑھی، قریب ہو ہنس کر بولی "میرا نام مالا ہے۔ آپ کتنی حسین ہیں! میں تو پہلی نظر میں ہی آپ کو دل دے بیٹھی۔ کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟"

اپنے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے میرے ہی اخبار کا دوسرا ورق گھاس پر بچھایا اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولی، "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میرا آپ سے شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ کیوں کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ شوہر صاحب مجھ پر مہربان ہیں، اور میں دو بچوں کی ماں بھی ہوں۔"

مجھے بے اختیار ہی ہنسی آ گئی۔ بولی "اگر آپ مرد ہوتیں تو یقیناً آپ سے شادی کر لیتی، کیونکہ آپ بھی کچھ کم حسین نہیں ہیں۔"

ارے بھگوان کا نام لیجیے، بھلا میں کہاں کی حسین ہوں! آپ مجھے زیادہ سے زیادہ قبول صورت یا گوارہ کہہ سکتی ہیں۔ یوں تو سیدھی سادھی صورت کے کچھ فائدے بھی ہیں، مثلاً" ہر ایرا غیرا عشق کا دم نہیں بھرنے لگتا، مردوں میں ایک بہت بڑی کمی یہ ہے کہ وہ اپنی صورت تو آئینے میں دیکھتے نہیں البتہ حسینوں پر جان نچھاور کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ کیہہ میں جھوٹھ بولیا؟"

اس نے آخری الفاظ ٹھیٹھ پنجابی لہجہ میں اس انداز سے ادا کیے کہ بس لطف آ گیا۔ میں نے بھی فوراً کہا "نہ تسی جھوٹھ بولیا، نہ نساں کفر تولیا۔"

ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ تب وہ بے تکلفی سے بولی "دل کے بہلانے کو جو بھی کہہ لیں، لیکن میں یا کون عورت ایسی ہوگی جو آپ کی طرح حسین ہونے کی تمنا نہ کرے؟ حسن تو بھگوان کی دین ہے۔ اگر یہ حاصل نہ ہو تو کیا آپ جیسے حسن والوں کی دہلیز پہ سجدہ بھی نہ کریں؟ آپ کا قرب حاصل کر کے آپ کے جلووں سے محظوظ بھی نہ ہوں؟...... کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

یہ تھی ہماری پہلی ملاقات! کچھ ہی دنوں میں ہم دونوں کی دوستی بہت گہری ہوگئی ہم ایک دوسرے کے لیے 'آپ' سے 'تم' ہوگئیں۔ وہ نوکری کرتی تھی، دفتر سے فرصت پا کر اس کا زیادہ تر وقت شوہر اور بچوں کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ پھر بھی ہر تیسرے چوتھے دن ہماری ملاقات ہو جاتی تھی۔ کبھی باغ میں، کبھی جھیل کے کنارے اور کبھی بازار میں، اکثر اس کے شوہر صاحب اور بچے بھی اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

مہینہ بھر کے اندر ہی ہماری اتنی گاڑھی چھننے لگی جیسے ہماری دوستی برسوں پرانی ہو۔

ایک روز میں نے اس سے کہا، "مالا دیدی! تم ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی ہو، چاہے دفتر میں چاہے گھر پر۔ میرے خیال میں تمہیں کبھی کبھی گھر والوں سے الگ بھی کچھ وقت گزارنا چاہیے۔"

میری بات سن کر مالا بولی، "میں تم سے متفق ہوں۔ یہ خیال تو کئی بار میرے دل میں بھی آیا لیکن کوئی ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ اچھا! اب کسی روز ہم دونوں ہی پکنک کا پروگرام بنائیں گے۔"

اسکے کچھ ہی دنوں بعد ایک روز مالا نے مجھ سے کہا " لو بھئی! کل ہم دونوں پنجور گارڈن میں پکنک منانے چلیں گی۔ اپنے گھر سے کچھ کھانے کا سامان لے آنا، اور میں بھی کچھ لیتی آؤں گی۔ صبح دس بجے کی بس سے ہم پنجور گارڈن کو روانہ ہو جائیں گی۔ چار یا پانچ بجے تک لوٹ آئیں گی۔ بولو منظور ہے؟"

" بالکل منظور ہے۔"

دوسرے دن ہم سیکٹر نمبر ۱۷ کے بس اڈے پر پہنچ گئیں، اطمینان سے بس میں بیٹھ کر ہم ادھر ادھر کی گپ ہانکتی رہیں۔ وقت گزرنے کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ راستے میں میں نے پوچھا " تمہاری غیر حاضری میں تمہارے پتی دیو اور بچے کیا کریں گے؟"

مالا بولی " بچوں کو تو میں نان کی نانی کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ وہاں وہ سارا دن بہت خوش رہیں گے۔ اپنے پتی دیو ا۔۔۔۔ تو ان سے میں نے کہہ دیا تھا کہ آج وہ کسی ہوٹل میں ہی بھوجن کر لیں۔"

" تو گویا کسی قسم کا جھنجھٹ نہیں ہوا۔"

" بالکل نہیں۔"

پنجور گارڈن پہنچ کر بس رکی تو ہم کھانے والے سامان کے تھیلے کندھوں پر لٹکائے اسکولی لڑکیوں کی طرح چہکتی ہوئی نیچے اتریں۔ گیٹ میں گھسنے کے لیے ٹکٹ خریدا۔

اس باغ کی کئی منزلیں ہیں۔ ہم دوسری منزل پر پہنچ کر بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگیں۔ آخر پیڑ کے نیچے دری بچھا کر ڈیرہ لگا

دیا اور تاش نکال کر پلُو کھیلنے لگیں ۔

آہا! کتنا لطف آرہا تھا! اس وقت مالا بھی خوب چہچہا رہی تھی ۔

کچھ گیم GAME ہو چکے تو پتے بانٹتے بانٹتے مالا کے ہاتھ رک گئے اور وہ ایک سمت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی ۔ میں نے پوچھا ۔

"کیا بات ہے ؟"

مالا نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سرگوشی میں جواب دیا "میرے باس Boss چلے آرہے ہیں ۔ اُن کو سب ساہی صاحب کہتے ہیں ۔ نہ جانے کیسے اُن کی نظر مجھ پر پڑ گئی ہے ۔"

میں نے بھی مڑ کر دیکھا تو ایک بلند و بالا حسین نوجوان نظر آیا جو دور ہی سے مسکراتا چلا آرہا تھا ۔

مالا نے پھر سرگوشی میں کہا "برا مت ماننا گنی! یہ اتفاق سے ادھر آنکلے ہیں میرے باس ہیں ، ان کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہوگا ۔"

میں نے آہستہ سے کہا "کوئی بات نہیں ۔ ایسا اتفاق بھی ہو جاتا ہے ۔"

اسی اثنا میں ساہی صاحب ہمارے کافی نزدیک پہنچ گئے ۔ ہنستے ہوئے بولے "ہیلو! مالا جی ۔"

"ہیلو! سر!"

وہ پھر بولے "میں کبھی کبھار سیر کے لیے یہاں بھی آنکلتا ہوں ۔ کوئی نہ کوئی دوست بھی مل جاتا ہے اور وقت اچھی طرح کٹ جاتا ہے ۔ بدقسمتی سے آج مجھے ایک بھی دوست دکھائی نہیں دیا ۔ بہت بور ہو رہا تھا کہ اچانک

ہی آپ پر نظر پڑی اور میں ادھر چلا آیا۔"

"یو آر موسٹ ویلکم

آئیے نا! آپ بھی بیٹھ جائیے۔"

ابھی تک ساہنی صاحب میری طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ مجھ پر نظر پڑی تو ہچکچاتے ہوئے مالا سے کہنے لگے "نہیں میرا یہاں بیٹھنا مناسب نہیں ہوگا۔ معاف کیجیے! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے ورنہ میں آپ کو ہرگز ڈسٹرب DISTURB نہ کرتا۔"

مالا نے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر ساہنی صاحب سے مخاطب ہو کر بولی "کوئی ہرج نہیں۔ یہ بھی کوئی غیر نہیں ہیں، میری چھوٹی بہن ہے ..... میرا مطلب کزن COUSIN سے ہے۔ یہ میرے دوسرے انکل کی بیٹی ہے۔"

ساہنی صاحب نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کی۔ میں نے بھی جواب میں ہاتھ جوڑ دیئے۔

ایک بار ساہنی صاحب نے رخصت ہونے کے لئے اجازت چاہی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "آپ سے بھی معافی چاہتا ہوں۔ میں نے خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ ڈال دی۔"

ان کے بولنے کا انداز اتنا مہذب تھا اور دیکھنے میں وہ اتنے حسین تھے کہ بے اختیار ہی میرے منہ سے نکل گیا "آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہے تو آپ بڑی خوشی سے تشریف رکھیے۔"

میری بات سن کر مالا کو اطمینان ہوا۔ بولی "ہاں، ساہی صاحب! آپ ہمارے پاس ہی تشریف رکھیے نا! ہم پلیو کھیل رہے ہیں، آپ بھی شامل ہو جایئے۔"

اس کے بعد ہم نے پیچھے کھسک کر ساہی صاحب کے بیٹھنے کے لیے دری پر جگہ چھوڑ دی۔ مگر ساہی صاحب نے جیب میں سے بڑا سا رومال نکالا اور اسے گھاس پر بچھاتے ہوئے بولے "تکلف مت کیجیے! میں یہیں پر بیٹھ جاؤں گا۔"

وہ بیٹھ گئے تو مالا کہنے لگی "ارے معاف کیجیے گا۔ میں آپ دونوں کا باقاعدہ تعارف کرانا تو بھول ہی گئی۔ ہاں تو ساہی صاحب! یہ میری کزن ہے۔ نام گنی ہے بی۔ایس۔سی کر چکی ہے اور اب ڈاکٹری کا کورس کرنے کی تیاری میں ہے۔"

ساہی صاحب نے پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

تب مالا نے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "گنی! یہی میرے باس ہیں جن کے بارے میں تمہیں پہلے بھی بہت کچھ بتا چکی ہوں۔"

یہاں پر مالا جھوٹ بول گئی، کیونکہ اس روز سے پہلے ساہی صاحب کے بارے میں اس نے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

خیر! ساہی صاحب ہمارے کھیل میں شامل ہو گئے۔ خوب مزے

کا گیم (GAME) جما۔ کھیل کے دوران باتوں کی پھلجھڑیاں بھی چھوٹتی رہیں،
وقت کافی گزر گیا تو مالا نے تاش کے پتے دری پر پٹختے ہوئے کہا "بس
کھیل ختم۔ مجھے تو بڑی زور کی بھوک لگی ہے "
اب ساہی صاحب نے رخصت چاہی لیکن ہم دونوں نے بڑے اصرار سے
انہیں بٹھائے رکھا اور کہا کہ ہمارے ساتھ کھانا بھی کھائیے۔ کیوں کہ ہمارے پاس
کافی کھانا موجود ہے۔
مجبوراً ساہی صاحب پھر بیٹھ گئے۔ بھوجن کا مزا بھی خوب آیا۔ اس دوران
ساہی صاحب نے ایسے مزیدار چٹکلے سنائے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ
گئے۔ میں سوچنے لگی کہ اگر وہ نہ آتے تو ہمارا لطف یقیناً ادھورا رہ جاتا۔
کھانا ختم ہو چکا تھا تو ساہی صاحب بولے "لیڈیز! اب کافی پلانے کی
اجازت مجھے ملنی چاہیئے۔"
"اجازت ہے" مالا جھٹ سے بول اٹھی۔
ساہی صاحب ہمیں اس چبوترے پر لے گئے، جس کے دائیں بائیں فوارے
چھوٹے ہوئے تھے۔ اور جہاں ایک چھوٹی سی دکان بھی تھی۔ ہم بید کی کرسیوں
پر بیٹھ گئے۔ فواروں سے اڑ کر پانی کے ہلکے ہلکے چھینٹے ہمارے چہروں پر گرنے
لگے تو کافی پینے کا لطف دوبالا ہو گیا۔
وہاں بھی ہم بہت دیر تک بیٹھے رہے جب چار بجے تو مالا بولی "اب
واپس چلنا چاہیئے۔"
ہم تینوں باغ سے باہر آ گئے تو مالا نے ساہی صاحب سے رخصت چاہی

اس پر وہ کہنے لگے کہ بس پر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ ان کی ذاتی کار وہاں موجود تھی۔

اُن کی اِمپورٹیڈ (IMPORTED) کار میں واپس لوٹنے کا الگ ہی لطف تھا۔ وہ اتنے ہنس مکھ تھے کہ راستے بھر کوئی نہ کوئی ہنسی مذاق کی بات کرتے رہے۔ پہلے وہ ہمارے ہی بنگلے کے آگے رُکے۔ نیچے اتر کر میں نے کچھ دیر کیلئے اندر آنے کو کہا۔ لیکن وہ بولے کہ پھر کبھی آئیں گے۔

جب میں اپنے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی تو میرے کانوں میں ساہی صاحب کی آواز سنائی دی۔ "بالا جی، آپ کی ہر کزن ایک سے ایک بڑھ کر حسین ہے"

میجر آنند

گلاب کے پھولوں کا شہر میں مقابلہ ہونے والا تھا۔ میں دانتوں میں پائپ دبائے اپنے بنگلے کے سامنے والے لان پر آرام کرسی میں دھنسا اس موضوع پر اپنے مالی سے بات چیت کر رہا تھا۔ ہماری گفتگو ہو چکی تو مالی وہاں سے چل دیا۔ تب میری نظر اس خاتون پر پڑی جو شاید کچھ دیر سے وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی مجھے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کا جواب دیدیا تو وہ چند قدم بڑھ کر میرے پاس پہنچ گئی۔ میں نے بیٹھنے کے لیے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا تو اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"آپ گنی کے ڈیڈی ہیں نا؟"

"جی ہاں لیکن گنی اس وقت بنگلہ میں موجود نہیں ہے"۔
"کوئی ہرج نہیں۔ میں دراصل آپ ہی سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئی ہوں"۔
یہ سُن کر مجھے قدرے تعجب ہوا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھ سا ساٹھ سالہ بوڑھے سے ایک جوان اور قبول صورت خاتون کو کیا کام ہو سکتا ہے۔
میں نے کہا "فرمائیے!"
لمحہ بھر کو وہ ہچکچائی اور پھر کہنے لگی "میں شادی کے سلسلہ میں آپ سے بات کرنے آئی ہوں"۔
میں چونکا ہو گیا اور منہ سے پائپ کی ڈنڈی باہر نکال کر جواب دیا "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں! بھلا اس عمر میں میں شادی کروں گا کیا!"
"میں آپ کی نہیں، گنی کی شادی کی بات کرنے آئی ہوں"۔
میں قدرے جھینپ کر بولا "اوہ! فرمائیے، آپ جانتی ہی ہوں گی کہ ہر باپ کو اپنی جوان لڑکی کی شادی کا کتنا خیال ہوتا ہے"۔
"اب آپ کو اس سلسلہ میں کچھ بھی چنتا کرنے کی ضرورت نہیں ہے میری نظر میں ایک لڑکا ہے اُس کا نام ونود ساہنی ہے، بہت بڑی فرم کا مالک ہے، اونچا لمبا حسین جوان ہے، تعلیم یافتہ ہے اور روپے پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں ہے"۔
میں نے کہا۔۔۔۔ "معاف کیجیے! آپ نے آنے میں دیر کر دی"۔
یہ سنتے ہی اس کا چہرہ اتر گیا اور وہ بے اختیار بول اٹھی "ہائی گاڈ! تو

گویا آپ نے گنی کا رشتہ پہلے ہی سے طے کر دیا۔"

" جی ہاں۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس نوجوان سے میری بیٹی کا رشتہ کیوں کرانا چاہتی ہیں؟"

" اب کیا بتاؤں! دراصل جس روز میں پہلے پہل ساہنی صاحب کے یہاں نوکری کے سلسلہ میں گئی تھی۔ اس روز مسٹر ساہنی نے مجھے اس کار میں سے اترتے دیکھ لیا جس کی لفٹ لے کر میں ان کے ہاں پہونچی تھی، کار کو چلانے والی ایک حسین لڑکی تھی میرا انٹرویو تو ناکامیاب رہا اور ملازمت ملنے کی کوئی امید نہیں تھی، تب ایکا ایک مسٹر ساہنی نے مجھ سے دریافت کیا کہ جس کار میں سے میں اتری تھی۔ اس کی مالکن لڑکی کون تھی، دراصل میں اس لڑکی کو بالکل نہیں جانتی تھی محض اس کی کار میں لفٹ لے کر دفتر تک پہونچی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ مسٹر ساہنی کو اس لڑکی سے گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ سوچا کہ اگر میں نے سچ سچ بتا دیا کہ وہ لڑکی میرے لیے بالکل اجنبی تھی، تو ساہنی صاحب کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ میں نے فوراً کہہ دیا کہ وہ لڑکی میری بہن ہے، یعنی کزن۔۔ میرے انکل کی بیٹی۔ اب مسٹر ساہنی کا چہرہ کھل اٹھا۔ مجھے نوکری مل گئی۔ اس کے بعد ساہنی صاحب نے کئی بار اس لڑکی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، یہ بات میرے لیے ناممکن تھی۔ میں کسی نہ کسی حیلہ سے ٹالتی رہی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ ساہنی صاحب اس لڑکی سے ملنے پر تلے ہوئے تھے۔ ایک دن گارڈن میں اتفاق سے میری نظر گنی پر پڑی۔ اس کا تابناک حسن دیکھ کر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے گنی سے دوستی گانٹھ لی۔ بعد

میں اس کی ملاقات پنجور گارڈن میں مسٹر ساہی سے کرادی، گنی کار والی لڑکی سے کہیں زیادہ حسین تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ساہی صاحب کو پہلی لڑکی بھول گئی اور وہ گنی سے محبت کا دم بھرنے لگے، گنی کو بھی ان سے پیار ہو گیا، یہاں تک کہ وہ شادی پر آمادہ ہو گئی۔ اس لیے میں اپنی دانست میں آپ کے پاس پہلے ہی سے حاضر ہو گئی تاکہ اگر مسٹر ساہی اس سلسلہ میں آپ کے پاس آئیں تو آپ بغیر سوچے سمجھے انکار نہ کر دیں، مگر بد قسمتی سے آپ نے پہلے ہی گنی کا رشتہ طے کر دیا، میرے لیے پھر سے مصیبت کھڑی ہو جائے گی، کیونکہ مسٹر ساہی کار والی لڑکی کے بارے میں مجھ سے پوچھ تاچھ کرنے لگیں گے اور ملاقات پر اصرار بھی کریں گے، کاش! آپ نے میرے آنے سے پہلے یہ رشتہ طے نہ کیا ہوتا۔"

میں نے اپنی مونچھوں تلے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کو فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، دتو دساہی آپ کے یہاں آنے سے پہلے ہی میرے پاس پہنچ گیا تھا، لڑکا مجھے بہت پسند آیا، چنانچہ میں نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔"

یہ سن کر اس خاتون کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، میں نے پھر کہا "آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"بالا! میری شادی ہو چکی ہے اور دو بچے بھی ہیں۔"

اب وہ جانے کے لیے اٹھی ہی تھی کہ گنی آپہنچی، دونوں سہیلیاں بڑے تپاک سے ملیں، گنی نے بالا کو روکنا چاہا، لیکن وہ بولی "پھر کبھی آؤں

گی۔ ابھی بہت جلدی میں ہوں۔"

اس کے بعد مالا نے میری جانب دیکھ کر کہا۔"اس رشتہ کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ!"

یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئی۔

رگنی نے حیرت سے کہا۔"ڈیڈی! یہ بڑی عجیب لڑکی ہے مبارک باد دینے کے بجائے شکریہ ادا کر رہی ہے، یہ بات اپنے تو پلے نہیں پڑی۔"

میں چپ چاپ مسکراتا رہا۔ رگنی نے مجھے مسکراتے دیکھا تو چڑھ کر بولی۔ "ڈیڈی، آپ بھی عجیب آدمی ہیں آپ ہی بتائیے کہ یہ مبارک باد کہنے کا موقع تھا کہ شکریہ ادا کرنے کا؟"

"میرے خیال میں تو شکریہ ہی ادا کرنا چاہیے تھا۔"

اس پر رگنی بھڑک اٹھی، بولی"اس میں تو آپ دونوں کی سازش معلوم ہوتی ہے، آخر آپ مالا کو کب سے جانتے ہیں؟"

"یہی بتیس پچیس سال ہوئے جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔"

"اُف! میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا"پاگل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تم جا کر خانساماں سے کہو کہ وہ ہم دونوں کے لیے کافی تیار کر کے لے آئے، تب میں اطمینان سے بتاؤں گا کہ مالا نے یہ حرکت کیوں کی۔"

یہ سن کر رگنی خانساماں کو کافی کا آرڈر دینے کے لیے کچن کی طرف چلی گئی۔

جب تک وہ لوٹ کر نہیں آ گئے ہیں پائپ کا دھواں اڑاتا رہا اور چُپ چاپ مسکراتا رہا!!!

پنجاب کا البیلا

یوں تو اس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی، لیکن میں اس قدر دبلا پتلا اور مختی سا لڑکا تھا کہ بہ مشکل گیارہ بارہ برس کا دکھائی دیتا تھا۔

ان دنوں میں شہر کے ایک اسکول میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا، اور بورڈنگ میں رہتا تھا، یہ بورڈنگ تو برائے نام ہی تھا اسے گھوڑوں کا اصطبل کہنا زیادہ موزوں ہوگا، شہر سے باہر ایک کچی سڑک کے کنارے ایک بڑی سی عمارت تھی جس کے ارد گرد کچھ جگہ چھوڑ دی گئی تھی، عمارت چوکور تھی، اندر گھاس کا ایک بہت بڑا قطعہ تھا، جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برآمدہ تھا، فرش کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں اور ان میں سے گرد نکل نکل کر چلنے والوں کے قدموں کے ساتھ اڑا کرتی تھی، کمرے بہت بڑے بڑے تھے، اور ایک ایک میں کئی کئی لڑکے رہتے تھے، ہر لڑکے کے لیے الماری، ایک چارپائی، ایک کرسی اور آدھی میز مخصوص تھی۔

باورچی خانے کا کل انتظام لڑکوں کے سپرد تھا، رسوئی میں تین نوکر تھے، ایک باورچی اور دو نوکر کھانا کھلاتے اور دوسرے کاموں کیلئے۔

باورچی خانے میں کوئی شے مول تھوڑے آتی ہے، سب کے سب جاٹوں کے لڑکے تھے، گھی اور گیہوں گھروں سے آ جاتے تھے، اور مرضیات

کی باقی چیزیں مثلاً ایندھن، سبزی، ترکاری مار دھاڑ سے حاصل کی جاتی تھی، ہوسٹل کے پیچھے ایک ارائیں[1] کے کھیت تھے، اس ارائیں کی ایک طرح دار لڑکی اور دو سجیلے بیٹے تھے، دن بھر لڑکے ہوسٹل کی چھت پر بیٹھے لڑکی کو آنکھیں مار مار کر اشارے کرتے اور راتوں کو کھیتوں سے تازہ سبزیاں اڑا لاتے، بچارے آرائیں نے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ سے ان لڑکوں کی شکائتیں کی، لیکن بچارا سوکھے ہوئے چہرے والا سپرنٹنڈنٹ اپنی داڑھی کھجلا کر رہ جاتا، وہ خود ناچار تھا ارائیں کو تشفی دے کر واپس بھیج دیتا اور لڑکوں سے محض زبانی باز پرس کرتا۔۔۔۔ لیکن لڑکوں کے معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔

سپرنٹنڈنٹ پکا سکھ تھا، خوب لمبی لہراتی ہوئی داڑھی، پھیکے پیلے رنگ کی پگڑی پر اس کا یہ بڑا نیلے رنگ کا صافہ، تنگ پاجامہ، ڈھیلا ڈھالا کرتا اس کا ازار بند اس سے کبھی نہیں سنبھلتا تھا، ہمیشہ نیچے لٹکتا رہتا، ہر روز بلا ناغہ گوردوارے جا کر پاٹھ کرتا۔۔۔ وہ لڑکوں کی اس زیادتی کے سخت خلاف تھا لیکن ہوسٹل میں اس کی حیثیت بس برائے نام ہی تھی، بچارے کی بیوی اور بچے ہمیشہ بیمار رہتے، ان کی تیمار داری سے فرصت پاتا تو کبھی کبھار ہوسٹل میں آنکلتا، لڑکے بظاہر اس کا بڑا احترام کرتے تھے لیکن حقیقت میں انہیں اس کی کوئی پرواہ نہ تھی،

جب وہ ہوسٹل میں داخل ہوتا تو عموماً باورچی خانے کا ایک نوکر اس کے ساتھ ہوتا برآمدے میں داخل ہوتے ہی وہ رک جاتا، اور ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا اس کا منہ اور آنکھیں ہمیشہ سوجھی رہتی تھیں اور آنکھوں

[1] زمینداروں کی ایک ذات

سے ہمیشہ پانی بہتا رہتا تھا۔ جسے وہ ایک جھاڑن نما رومال سے گا ہے گا ہے صاف کر لیا کرتا تھا۔ آتے ہی وہ ایک ہلکی سی جھوٹی کھانسی کھانستا کہ سب کو اس کی آمد کی خبر ہو جائے، سب سے پہلے وہ نوکر سے گفتگو شروع کرتا، کسی معمولی سی بات پر باز پرس ہونے لگتی، ہوں ۔۔۔ کیوں بے سوّر! یہ پانی یہ تو نے گرایا! ابے راستے ہی میں ۔۔۔ ایں! ہے۔ کسی نے بھی گرایا، تو نے اسے صاف کیوں نہیں کر دیا جھاڑو سے۔

اتنے میں لڑکوں کو بھی معلوم ہو جاتا کہ حضرت آ گئے ہیں۔ عموماً سب سے پہلے لبندا دسنگھ جس کا چہرہ چقندر کی طرح سرخ تھا ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آگے بڑھتا اور بڑی متانت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا: "ست سری اکال سرکار جی!"

"ست سری اکال"۔ پھر سپرنٹنڈنٹ کا پہلا سوال یہ ہوتا۔۔۔ "کیوں سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

لبندا دسنگھ یہ بڑا ہاتھ دھپ مارنے کے انداز میں اٹھا کر کہتا: "ساب ٹھیک ٹھاک ہے جی۔"

سپرنٹنڈنٹ قدرے سکوت کرتا، اب اور لڑکے بھی جمع ہونے شروع ہو جاتے۔

سپرنٹنڈنٹ کے جسم کی بناوٹ بھی عجیب سی تھی۔ موٹا تو وہ تھا ہی لیکن ورزش نہ کرنے کی وجہ سے اوپر کا دھڑ اور ٹانگیں ہلکی تھیں اور پیٹ خوب پھولا ہوا۔ چنانچہ جب وہ اطمینان کے ساتھ بڑی سنجیدہ صورت بنا کر کوٹ کو پیٹ کے آگے سے ہٹا کر دونوں ہاتھوں کو کولھوں پر رکھ کر کھڑا ہوتا تو اس کا پھولا ہوا پیٹ

اور بھی آگے کو بڑھ جاتا، اور وہ کسی سپیرے کی بین کی طرح نظر آنے لگتا۔ اسے دیکھ کر لڑکوں کو ہنسی آجاتی۔ سپرنٹنڈنٹ دل میں سمجھتا تھا کہ لڑکے اسی پر ہنس رہے ہیں۔ چنانچہ وہ مقبول ہونے کی غرض سے ذرا بے تکلف ہو کر بناوٹی غصّہ سے پوچھتا: "لبدا سنگھ تم بڑے شیطان ہو گئے ہو"۔

"جی میں؟" لبدا سنگھ اپنی موٹی سی انگلی اپنے سینہ پر رکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا: "باگورو۔۔۔ میں تو آپ کا داس ہوں جی، کہیے تو ابھی سر تار کر رکھ دوں، قدموں میں۔"

اس بات پر لڑکے خوب قہقہے لگا کر ہنستے، کوئی لڑکا کسی کی اوٹ میں ہو کر کہتا "کس کا سر؟"

اب لبدا سنگھ نتھنے پھلا کر للکارتا: "اوے اوے۔۔۔ بچو پہرواجی کھڑے ہیں ورنہ ابھی تیرا بھرتا بنا دیتا پکڑ کر۔"

اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ اسی طرح باتیں کرتا ہوا سارے ہوسٹل میں لٹو کی طرح گھوم جاتا، اور باہر نکلنے سے پہلے ایک مرتبہ لڑکوں کو تنبیہ کے طور پر کہتا "اچھا اب سبزی بازار سے آتی ہے نا؟"

"جی بالکل۔۔۔ اب تو ہم روز کا حساب بھی لکھ کر رکھتے ہیں، دیکھیے گا؟"

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ لیکن وہ اسی بات پر مطمئن تھا کہ کم از کم اس کی عزّت تو رکھ لیتے ہیں۔ وہ اسی بات پر اپنی خیر مناتا حساب وغیرہ دیکھے بغیر اچھا اچھا کہتا ہوا چلا جاتا۔

اس کے جانے کے بعد لبدا سنگھ پانی کے گلاس میں پہلے چند بوندیں

آنکھوں پر ٹپکا لیتا۔ کولھوں پر ہاتھ رکھ کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے، آنکھیں پونچھتا ہوا کہتا: "ادھوں ادھوں ... لینا دسنگھ اسب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

میں نہ صرف کم سن بلکہ دبلا پتلا بھی تھا، اس لیے وہ سب مجھے بجائے میرے اصلی نام کے بکری سنگھ کہہ کر پکارتے تھے۔ بکری سنگھ نام تو بہت بُرا تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد میں اس نام سے مانوس ہو گیا۔ اب مجھے بکری سنگھ مذاقاً شاذ و نادر ہی کہا جاتا تھا۔ نہایت سنجیدہ گفتگو میں بھی سب مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔ میں کمزور تھا، اور وہ لوگ سرکاری سانڈوں کی طرح پلے ہوئے تھے، لیکن وہ مجھ پر ہاتھ اٹھانا گئو ہتیا کے برابر پاپ سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اگر کبھی میں طیش میں آ کر ان میں سے کسی کو لڑنے کے لیے للکارتا بھی تو وہ میرے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ میں اپنی کمزوری کے طفیل ان لوگوں میں قطعاً محفوظ تھا۔

ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں کسی سکھ تہوار کی ہفتہ بھر کی چھٹیاں ہوئیں تقریباً سبھی لڑکے بوریا بستر باندھ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ میں محنتی لڑکا تھا، پہلے تو ہوسٹل ہی میں چھٹیاں گزارنے کا ارادہ کیا لیکن پھر اتنے بڑے ہوسٹل میں اکیلے جی نہ لگا۔ نہ وہ تر و تازہ سبزیاں نہ وہ چہل پہل۔ رات کے وقت تاریک برآمدوں میں بھتنے ناچتے دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ دو ہی دن بعد میں نے بھی اپنے گاؤں جانے کی ٹھانی۔

گاؤں میں میری اماں، پھوپھی اور دو بڑے بھائی رہتے تھے۔ میں نے میلے کپڑوں اور چند کتابوں کی گٹھڑی باندھی اور سائیکل کے پیچھے کیریر پر رکھ

کی رسی سے باندھ دی پچیس میل کا سفر تھا۔ پمپ سولیوشن ربڑ وغیرہ ضروری سامان چمڑے کے چھوٹے تھیلے میں رکھ لیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا اور دھوپ کی تمازت نسبتاً کم ہوئی تو چل دیا۔

اس وقت پانچ بجے تھے، خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے میں گاؤں پہنچ جاؤں گا۔

جب شہر سے باہر نکل آیا تو ایک کمہار کی دکان پر رکنا پڑا۔ میں شام کو جب کبھی ادھر سے گزرتا تھا تو میری آنکھیں کسی کی تلاش میں اس دکان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ کمہار کی بیوی بہت خوبصورت تھی، اس کا سن اگرچہ تیس سے کم نہ تھا لیکن تھی بڑی طرحدار۔ اور پھر اس کی چہاردہ سالہ لڑکی کے کیا کہنے، میں شرمیلا اور خاموش مزور تھا لیکن بچپن ہی سے ایک حسن پرست طبیعت اور عاشقانہ مزاج رکھتا تھا۔ کمہار کی بیٹی کو دیکھ کر مجھے سوہنی کا خیال آ جاتا تھا۔ سوہنی بھی کمہارن تھی، وہ لوگ اس قسم کے قصوں کو باور نہیں کرتے، اور انہیں ڈھکوسلوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن میری نظروں کے سامنے یہ زہرہ جبیں لڑکی تھی، اس پر کوئی بڑے سے بڑا شہزادہ بھی عاشق ہو سکتا تھا۔ میرا عشق کس قدر بے بس اور اپنے آپ ہی میں سلگنے والا تھا، نہ میری شکل اچھی تھی نہ جسم مہینوال جب سوہنی کمہارن کی دکان پر گیا تھا تو اس نے ساری کی ساری دکان ہی خرید ڈالی تھی لیکن میں دکان تو کیا خرید کرتا۔ بس اس کی صورت دیکھنے کے لئے وہاں چلا جاتا۔ کبھی مٹی کا دیا یا ایک پیالہ یا صراحی خرید لیتا اس کی ماں پرے کھاٹ پر بیٹھی رہتی تھی، مجھے مطلوبہ برتن اٹھا اٹھا کر دکھاتی۔ اس کی ماں

مجھے نابالغ سمجھ کر اُس طرف زیادہ توجہ نہ کرتی تھی۔ اِدھر میں جی بھر کر اُس ننھی سوہنی کو دیکھا کرتا۔ وہ بھی الھڑ ہی سی تھی۔ اُسے کبھی میری آنکھوں میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ وہ سرد مہری سے میری طرف دیکھتی۔ "اچھا یہ پیالہ تمہیں پسند نہیں ... کیا خرابی ہے۔ اس میں ... اچھا یہ لو..."

میں مرعوب ہو کر کہتا: "نہیں نہیں اگر تم کہتی ہو تو میں یہی خرید لیتا ہوں"

وہاں سے برتن لا کر میں ہوسٹل کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیتا اور دل شکستگی کے عالم میں ہوسٹل کے اندر داخل ہو جاتا۔ تو اودھم سنگھ میرا منہ لٹکا ہوا دیکھ کر پکار کر کہتا: "سنا بائی بگری سہنیا"

اس دن جب میں ان کی دکان کے سامنے رکا تو اس وقت ماں تو "تماّیا" گرمی کے مارے مکان کے اندر گھس بیٹھی تھی۔ البتہ لڑکی سر پر کپڑے کا ایک ٹکڑا ڈالے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ اس کا چہرہ گرمی سے تمتمایا ہوا تھا۔ گال خوب سُرخ ہو رہے تھے میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آن پھنسا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ مجھے کبھی اپنے گال چومنے کی اجازت دے دے ... "کیا چاہیے" اس نے پیٹھ موڑ کر کوئی برتن ہلاتے ہوئے کہا۔ میں نے کوئی اچھی صراحی طلب کی۔ اس نے نمکین مٹی کی بنی ہوئی صراحی میری طرف دھکیلتے ہوئے کہا: "یہ لے جاؤ پانی ایسا ٹھنڈا ہوا کرے گا کہ بس یاد کرو گے عمر بھر۔"

عمر بھر یاد کرنے والی بات تو اس نے محض دکانداری کے خیال سے کہہ دی تھی۔ لیکن میرا دل چھاتی کے قفس میں سے نکل کر اس کے قدموں پر نثار

ہو جانا چاہتا تھا۔ میں اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ میں تو اسے ہر وقت یاد کیا کرتا ہوں، لیکن کہہ کچھ نہ سکا۔۔۔۔ میں تھوڑی دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے دانت نکال کر کہا "اب میں گاؤں جا رہا ہوں"۔ "پھر کب آؤ گے؟" یہ کہہ کر وہ میرا جواب سنے بغیر اپنے کام میں مصروف اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔۔۔۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے جلدی سے دام دیئے اور پیڈل پر پاؤں رکھ کر چل کھڑا ہوا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آخر اس نے یہ بات کیوں پوچھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک سراب ہے۔ اسی لیے مجھے یہ اس قدر عزیز بھی تھا۔ دل ہی دل میں میں شاداں و فرحاں سفر پر روانہ ہو گیا۔

دھوپ ڈھل پڑ چکی تھی لیکن گرمی اب بھی کافی تھی۔ سڑک بڑے بڑے کھیتوں میں سے ہو کر جاتی تھی۔ راستے میں سڑک کے ذرا پرے ہٹ کر جابجا رہٹ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کنوؤں کا صاف و شفاف پانی چھالوں میں گرتا ہوا آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اِن پرانے کنوؤں کے ارد گرد قینچی سے کتری ہوئی داڑھیوں والے کسان موٹے سوتی کپڑے کے تہبند باندھے، بڑے سرور کے عالم میں حقے گڑگڑاتے نظر آتے تھے۔ جب کنوؤں پر کام کرنے والی لڑکیاں اور عورتیں کھیتوں میں مٹک مٹک کر اِدھر اُدھر چلتی تھیں تو ان کی لمبی لمبی چوٹیاں ناگنوں کی طرح بل کھا کھا کر لہراتی تھیں۔ بیلوں کی ٹانگوں میں گھس گھس کر بھونکنے والے کتے اپنا الگ شور مچا رہے تھے، اور اپنی میلی کچیلی چیتھڑیوں میں، سوکھے ہوئے گوبر کے ٹکڑے جمع کرنے

والی لڑکیاں کبھی کبھی اپنا کام چھوڑ کر۔ گلہریوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگتی تھی۔

ابھی میں نے چار پانچ میل ہی کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سائیکل پنکچر ہو گئی۔ میں نے سڑک سے ہٹ کر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی رہٹ بہت پیچھے رہ گیا تھا، چنانچہ ایک جوہڑ کے کنارے سائیکل کو الٹا دیا، ٹیوب میں بہت بڑا پنکچر ہو گیا تھا، ڈبل پنکچر لگانے میں بیس پچیس منٹ صرف ہو گئے۔ دو میل چل کر سائیکل کی ہوا پھر نکل گئی۔ اب کے پانی بھی قریب نہیں تھا، چنانچہ سائیکل لڑھکاتے ہوئے آدھ میل کے قریب پیدل چلنا پڑا۔ سڑک کے کنارے ایک گاؤں آباد تھا، وہاں ایک سائیکل والے کی دکان بھی تھی، میں نے سائیکل اس کے سپرد کر دی۔ میرا لگایا ہوا پنکچر اکھڑ گیا تھا، اسے از سرِ نو درست کیا گیا۔ اسی گڑبڑ میں سورج افق تک جا پہنچا، اور میں نے ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں کیا تھا، پنکچر لگ جانے پر میں نے سائیکل خوب تیز چلادی یہاں تک کہ راستے میں مرغیاں کڑکڑاتی اور پھڑ پھڑاتی ہوئی ادھر ادھر دیواروں پر جا بیٹھیں ۔۔۔۔ گاؤں سے باہر نکلا تو سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا، کھلی ہوا تھی، دھواں، گرد، شہر کی پکی دیواروں کی تپش وغیرہ کا نام تک نہ تھا، کچھ دور تک میں نے خوب زور سے سائیکل چلائی۔ یہاں تک کہ میں ہانپ گیا، پیاس بھی محسوس ہونے لگی، کھلے آسمان تلے کھیت حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ببول کے درخت جھنڈوں میں ایک دوسرے کے قریب قریب کھڑے ہوئے ایسے دکھائی دیتے تھے، جیسے سرگوشیاں

کر رہے ہوں کھیتوں کی پگ ڈنڈیاں قینچیوں کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتی
ہوئی دور تک چلی گئی تھیں دور افق میں کوئی شخص گھوڑے پر سوار اسے سرپٹ
دوڑائے چلا جا رہا تھا اس قدر تیزی اور روانی سے جیسے نہ تو اس کا گھوڑا کبھی تھکے
گا اور نہ زمین ہی کہیں پر ختم ہو گی بس اسی تندہی اور برق رفتاری سے ابد
تک دوڑتا چلا جائے گا اور وہ خود اسی جوش و خروش سے رہتی دنیا تک
اس پر بیٹھا رہے گا، بلند پرواز پرندوں کی ٹکڑیاں آسمان کی طرف پرواز کرتی
چلی گئیں، یہاں تک کہ پرندے چھوٹے چھوٹے نقطوں کی طرح نظر آنے لگے،
آسمان کی وسعت بے کنار تھی، اور پرندوں کی طاقت پرواز بے انداز ہوا کے
جھونکے چلنے لگے اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں اُگے ہوئے پودے
ایک رُخ کو سربسجود ہوتے جاتے تھے، جیسے کوئی ازلی نغمہ سُن کر وہ ایک ساتھ
سر دھن رہے ہوں در اصل وہ شاید قدرت کی ایک صدا تھی جسے سن کر سوار نے
منہ زور گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا، پرندے تیر کی سی تیزی کے ساتھ آسمان
کی وسعتوں میں پرواز کر گئے، اور کھیتوں میں پودے وجد میں آ کر جھومنے لگے،

موسم خوشگوار تھا میں نے رواں رواں کرتے ہوئے رہٹ کے قریب
سائیکل روک لی، نہانے کو جی چاہ رہا تھا، چنانچہ میں کپڑے اتار کر اودو
میں جا گھسا، بیلوں کی آنکھوں پر کھوپے بندھے ہوئے تھے وہ سر ہلاتے اور
منہ سے جھاگ اڑاتے تیز تیز قدم اٹھاتے گئے، رہٹ گیت گانے لگا اور
پانی اس تیزی سے باہر گر رہا تھا، جیسے کنوئیں میں پڑے پڑے اس کا دم
گھٹ گیا ہو، سرد پانی میرے جھلسے ہوئے جسم پر گرا تو میں نے ایک آسمانی

ا؎ کنوئیں کا چوبچہ

فرحت محسوس کی اور سنبھل کر جھال کے نیچے ہی بیٹھ گیا۔ پانی ململ کی طرح باریک چادر میں سے آسمان، زمین، درخت پودے، کلیلیں کرتے ہوئے بچھڑے، قلابازیاں لگاتے ہوئے مینڈک سب میری مسرت میں برابر کا حصہ لے رہے تھے،

میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا کسان، جس کی ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے کانوں کے پیچھے چکنے پٹے نظر آرہے تھے، حقہ گڑگڑاتا ہوا ادھر آنکلا۔ مجھے خوش دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اولوہیں سے نکلنے کو دل نہ چاہتا تھا، لیکن سورج غروب ہو چکا تھا اور افق کے قریب سیاسی مائل دھوئیں کی ایک لکیر سی کھینچ گئی تھی...... چنانچہ میں اولوہیں سے نکلا اور گیلے بدن کپڑے پہن کر پھر اپنے سفر پہ روانہ ہو گیا...

اَب میں نے سوچا کہ راستے میں کسی جگہ پر بھی نہیں رکوں گا۔ میں نے سائیکل پہلے سے بھی تیز چلا دی۔ پکی سڑک کا تقریباً آٹھ میل فاصلہ رہ گیا تھا۔ اور کھیتوں کا راستہ تقریباً آٹھ میل اور تھا۔ میری سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ نصف منزل پر ایک گاؤں تھا۔ جسے قلعہ کاہن سنگھ کہتے تھے، خاصہ بڑا موضع تھا۔ پانچ سات پکے مکانات بھی تھے، ایک چھوٹا سا سکول بھی تھا۔ پہلے خیال آیا کہ آج کی رات اسی گاؤں ہی میں گزار دوں۔ لیکن پھر گھر کا خیال آیا ہمارے گھر کے صحن میں ایک چھوٹا سا کنواں تھا، جس پر ایک لوہے کا ڈول پڑا رہتا تھا۔ سوچا کنوئیں پہ ڈول بھر بھر کر نہاؤں گا۔ ماں کئی کئی تہوں والے پراٹھے پکائے گی، اور میں ہری مرچوں کی چٹنی کے ساتھ

مزے لے کر کھاؤں گا۔ اگر راستے میں کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہ ہو تو میرے لیے گھر پہنچنا ناممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے پھر زور زور سے پیڈل چلانے شروع کر دیے۔ جب میں ایک زنّاٹے کے ساتھ گاؤں میں سے گزرا تو گاؤں کے ننگ دھڑنگ، پھولے ہوئے پیٹوں والے بچے "اوئے اوئے" کا شور مچاتے میرے پیچھے بھاگے۔ ادھ ڈیاں سونگھتے ہوئے کالے اور مٹیلے کتے بھی دمیں ہلاتے ہوتے میرے پیچھے پیچھے ہو لئے کتوں کو بے طرح بھونکتے دیکھ کر مسجد کے کچے چبوترے پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے طیش میں آکر حقے کی نئے کھینچ ماری۔ گاؤں سے باہر ایک مردہ بیل پر جھپٹے مارنے والے بڑے بڑے گدھ شور و غل سن کر ہراساں ہو گئے۔ اور اپنے لمبے لمبے پر پھڑاتے اور اچکتے ہوئے ذرا پرے ہٹ گئے۔ ادھر میں کسی فرار شدہ ڈاکو کی طرح بڑی تیزی سے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ لڑکے اور کتے بہت پیچھے رہ گئے۔ اور ان کا شور بھی مدہم پڑ گیا۔

آگے سنسان سڑک کے دونوں کناروں پر پاس پاس کھڑے ہوئے شیشم کے درختوں کے سلسلے شروع ہو گئے۔ ان کے نیچے گری ہوئی خشک پتیاں میری سائیکل کے پہیوں کے نیچے چرمر کرتی ہوئی گھومنے لگیں اور گاؤں کے بچوں کی طرح وہ دور تک تیزی سے چکر کھاتی ہوئی میرا پیچھا کرتیں اور پھر جب دم پھول جاتے تو وہ ہنس کر ایک جگہ بیٹھ کر رہ جاتیں۔

اب اکا تارا بھی نظر آنے لگا تھا۔ اور شفاف آسمان پہ زرد زرد چاند کسی

تالاب میں تیرتی ہوئی کانسی کی کڑاہی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔
دائیں بائیں دور تک ناہموار زمین پھیلی گئی تھی۔ خاردار جھاڑیوں کے سلسلے شروع ہو گئے تھے۔ یہاں پر بھیڑیوں کا بھی خطرہ تھا۔ اگر بھیڑیوں کا کوئی غول آن گھیرے تو پھر؟ میں خوفزدہ ہو کر سائیکل اور بھی تیزی کے ساتھ دوڑانے لگا۔ رفتہ رفتہ غروب آفتاب کے بعد دن کی رہی سہی روشنی بھی ختم ہو گئی۔ صرف چاند کی پھیکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ شیشم کے درختوں کی وجہ سے سڑک پر اور بھی زیادہ گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ میں اس سے پہلے صرف دو مرتبہ یہ سفر اکیلا کر چکا تھا۔ لیکن دونوں مرتبہ دن ہی میں سفر ختم ہو گیا تھا۔ .... میرا خیال تھا کہ دو ڈھائی میل پر کاکو شاہ کے مقبرے کے قریب سے سڑک چھوڑ کر اپنے گاؤں کی طرف گھوم جاؤں گا۔ دل کو کچھ اطمینان ہو چکا تھا کہ کم از کم سڑک کا سفر ختم ہونے والا تھا۔
میں اندھا دھند چلا جا رہا تھا کہ آگے سڑک رکی ہوئی معلوم ہوئی۔ جیسے نئے سرے سے بنائی جا رہی ہو۔ میں نے سائیکل دھیمی کر دی۔ نزدیک پہنچ کر پتہ چلا کہ واقعی سڑک بن رہی ہے۔ ساری سڑک اکھڑی پڑی تھی۔ مجبوراً سائیکل سے اتر کر ناہموار زمین پر پیدل چلنا پڑا۔ یہ ایک نئی آفت آن پڑی تھی۔

راستے میں سڑک کے کنارے کنارے پٹھان مزدوروں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ انہیں "راشے" کہا کرتے تھے۔ یہ "راشے" خوب موٹے تازے اور ہیبت ناک صورتوں والے ہوتے تھے۔ میں نے سنا

تھا کہ یہ لوگ بچوں کو بوریوں میں بند کر کے کابل لے جاتے ہیں، اور آٹھ دس روپے میں بیچ دیتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں خوفزدہ بھی تھا، لیکن بظاہر بڑے حوصلے کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کی لرزتی ہوئی روشنی میں راشوں کے چہروں کے خوفناک خطوط، الجھے ہوئے بال اور چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

بڑی مشکل سے یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اور میں پھر سائیکل پہ سوار ہو گیا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ اس وقت تک مجھے اوّل تو گاؤں میں پہنچ جانا چاہئیے تھا، یا گاؤں کے قریب ہی ہونا چاہئیے تھا، اب سوائے سفر جاری رکھنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کاکوشاہ کے مقبرے کے قریب پہنچکر میں پگ ڈنڈی پہ ہو لیا۔

تنگ راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا، اس لیے مجھے سائیکل سے اترنا پڑا۔ کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ مجھے ایک نشانی یاد تھی دو فرلانگ کے قریب ایک پرانا رہٹ تھا۔ جو آج کل سنسان پڑا تھا۔ میں نے پہلے اسی کا رخ کیا۔ جب پانی سے بچتا ہوا کنوئیں تک پہنچا تو دیکھا کہ آگے پانی اور بھی زیادہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ پگ ڈنڈی پانی ہی میں گم ہو گئی تھی۔ میں پانی سے بچتا ہوا خشکی کے راستے چلتا گیا۔ دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد پانی کم ہوا۔ اور میں اندازاً گاؤں کی طرف چل پڑا۔ لیکن بہت دور نکل جانے کے بعد بھی گاؤں کا کوئی نام و نشان تک دکھائی نہ دیا۔

دھندلی چاندنی میں میں چلتا ہی گیا۔ اب مجھے شک گزرا کہ کہیں میں
نے غلط راستہ تو اختیار نہیں کر لیا۔ ہر طرف نگاہ دوڑائی، کھیتوں اور درختوں کے
سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بعض کھیتوں میں کوئی فصل بھی کھڑی نظر آجاتی تھی
میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ یونہی اندھا دھند چلتا گیا کہ دفعتاً مجھے دور سے گرد
اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ
کوئی ترچھا بانکا سا نڈنی سوار چلا جا رہا ہے۔ سنسان جگہ، پھیکی چاندنی ر
جھینگروں کا شور.... پہلے خیال آیا اسے آواز دیکر راستہ دریافت کر
لوں، لیکن اس کی وضع قطع کچھ ایسی تھی کہ میں نے اسے بلانا مناسب
نہ سمجھا، بلکہ سوچ میں پڑ گیا کہ نہ معلوم یہ کون ہے۔ کاش! وہ مجھے دیکھے
بغیر آگے نکل جائے۔ میں سمٹ کر کیکر کے ایک چھوٹے سے درخت کے
نیچے جا کھڑا ہوا۔ لیکن اس درخت کے سائے میں بھی انسان کسی شخص
کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا.... اس کے ہاتھ میں ایک لمبے
دستے کی کلہاڑی دیکھ کر دم اور بھی خشک ہو گیا۔

وہ اپنے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ میری طبیعت کچھ سنبھلنے لگی....
دفعتاً اس نے رخ بدلا اور بظاہر میری طرف مڑا۔ میں نے سوچا شاید
وہ اس راستے سے سیدھا آگے کو چلا جائے گا۔ چنانچہ میں ذرا پہلو بدل
کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ سیدھا میری طرف آیا۔ اور قریب پہنچکر اس نے سانڈنی
روک لی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے اونٹ
کے اوپر ایک اور اونٹ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اکہرے بدن

کا مضبوط سکھ تھا۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا۔ ڈاڑھی چھوٹی چھوٹی اور چھدری سی، بھنویں گھنی، ناک جیسے پلنج کی چوپنج نتھنے پھولے ہوئے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی مگر چمکدار ٹھوڑی عین بیچ میں سے دبی ہوئی، کانوں میں سنہری بالیاں گلے میں سونے کا چمکتا ہوا کنٹھا۔

وہ تھوڑی دیر تک منہ کھولے میری جانب دیکھتا رہا، پھر اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کہو بھئی لونڈے! کون ہو تم؟"

میرا دل ڈوب گیا۔ "جی میں گاؤں کو جا رہا ہوں"۔

"کہاں سے آ رہے ہو"؟

"شہر سے آ رہے ہو"۔

"شہر سے ۔۔۔ جی"۔

"کیا کرتے ہو وہاں"؟

"جی پڑھتا ہوں"۔

"کیا پڑھتے ہو؟"

میں اس سوال پر ہنس پڑا۔ "کتابیں پڑھتا ہوں جی"

اس نے سائیکل کے پیچھے بندھی ہوئی گٹھڑی کو کلہاڑی کے دستے سے کچوکا دیتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے"؟

"جی اس میں میلے کپڑے ہیں ۔۔۔ کیا جی کھول کر دکھاؤں"؟

وہ ہنس پڑا۔ "رہنے دو"۔

میری جان میں جان آئی۔ اس نے ڈاچی کی نکیل کھینچی اور چلنے ہی لگا تھا کہ پھر رک گیا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"جی اپنے گاؤں کو۔"

"کونسا گاؤں؟"

"جی اکال گڑھ۔"

"اکال گڑھ؟"

"جی۔"

اس نے قدرے سکوت کیا۔ پھر اپنے کلّوں کے نیچے زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "اِدھر آؤ۔"

میں ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گیا۔ اُس نے کہا۔ "سائیکل نیچے رکھ دو۔"
میں نے سائیکل زمین پر ڈال دی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "میرا ہاتھ پکڑ کر میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

میں ڈرا لیکن اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے پیچھے اڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اوپر بیٹھے بیٹھے کلہاڑی میں سائیکل اڑا کر اوپر کھینچ لی۔ نکیل کو جھٹکا دیا اور سانڈنی اپنی بے ڈھنگی چال سے روانہ ہو گئی۔

میں نے اس کی پسینے میں تر گردن پر نظر جما دی۔ اس کے سر کے بال اس قدر کھینچ کر بندھے ہوئے تھے کہ اس کی گدی پر بالوں کی جڑوں کا گوشت اُدھڑ کر ابھر آیا تھا، جیسے ننھی ننھی پھنسیاں نکل آئی ہوں۔ ہولے ہولے اس نے پھر اپنی بیٹھی ہوئی بھاری آواز میں پوچھا۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا گاؤں کدھر کو ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اب تم اپنے گاؤں ہی کو جا رہے تھے۔

"جی میں راستہ بھول گیا تھا۔ میں پہلے شہر سے صرف دو ہی مرتبہ آیا ہوں۔ لیکن دن ہی دن میں گھر پہنچ جاتا تھا۔ لیکن آج رات ہو گئی اور پھر راستہ میں پانی بھی کھڑا تھا، اس لیے مجھے راستے کا پتہ ہی نہیں چلا۔"

اس پر اس نے اپنی بے باک آواز میں قہقہہ لگایا۔ "میاں! اگر تم رات بھر بھی اس طرح چلتے رہتے تو بھی اپنے گاؤں نہ پہنچ پاتے ...... تمہارے جیسے چھوٹے لڑکوں کو رات کے وقت سنسان جگہوں میں ہرگز نہیں گھومنا چاہیے۔"

اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ خوب مزے مزے کی باتیں کرنے لگا۔ پہلے تو میں دل ہی دل میں بہت ڈرا۔ میں نے سنا تھا کہ بعض لوگ نوعمر لڑکوں کے سروں میں سے مومیائی نکال لیا کرتے ہیں۔ سر مونڈ کر چوٹی میں ایک کیل ٹھونک دیتے ہیں اور ٹانگیں باندھ کر درخت سے لٹکا دیتے ہیں اور سر کے نیچے آگ جلا کر ایک کڑاہی رکھ دیتے ہیں۔ آگ کی گرمی سے سر کی چربی پگھل جاتی ہے، اور مومیائی کیل کے سرے سے بوند بوند کر کے کڑاہی میں ٹپکتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سر کی ساری مومیائی نکل جاتی ہے اور لڑکا مر جاتا ہے ...... سائیں کی صورت تو ہیبت ناک ضرور تھی لیکن اس کی باتوں سے کسی قسم کے خطرے کی بو نہ آتی تھی۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور خوش مزاج شخص تھا۔

کہنے لگا کہ تمہارے گھر میں کسی نے دن کے وقت کہانی کہی ہو گی تبھی تو

تم راستہ بھول گئے۔

میں سانڈنی کے کوہان سے پھسلا جاتا تھا، چنانچہ میں اس کی کمر سے لپٹ گیا اس کی گاڑھے کی قمیض پسینے میں تر ہو رہی تھی، بغلوں سے بکی بکی بو بھی آ رہی تھی۔ بازوؤں کے گھنے بال پسینے میں تر ہو کر چپک گئے تھے، اُس کے بوڑھے پر بندھی ہوئی جالی کے نیچے کو لٹکتے ہوئے پھندنے میرے نتھنوں اور آنکھوں میں گھس جاتے تھے۔ مجھے پہلے کبھی اونٹ کی سواری کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا اس قدر تکلیف دہ سواری تھی کہ بدن کا جوڑ جوڑ دُکھنے لگا، اور وہ میری تکلیف سے بے خبر اندھا دھند سانڈنی دوڑائے چلا جا رہا تھا۔۔۔ وہ بڑا باتونی شخص تھا۔ اس کی بھاری بھر کم بھرپور آواز اور قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی،

ہم ایک ایسے درخت کے قریب سے گزرے جس پر بئے کے گھونسلے لٹک رہے تھے، ایک گھونسلہ تو میرے اس قدر قریب تھا کہ میں نے اسے کھسوٹ لینے کیلئے ہاتھ بڑھا دیا، لیکن گھونسلہ میری زد سے باہر رہا۔ وہ کہنے لگا "بیا بڑا سمجھ دار پرندہ ہوتا ہے وہ اپنا گھونسلہ بڑی محنت اور کاریگری سے بناتا ہے۔ دنیا میں کوئی پرندہ اس قدر خوبصورت گھونسلہ نہیں بنا سکتا، تم نے بانسوں پر لٹکتے ہوئے گھونسلے نہیں دیکھے؟ بے حد خوشنما ہوتے ہیں ہوا میں لہراتی ہوئی ٹوپیاں سی ہیئے پھدک کر کبھی اندر چلے جاتے ہیں، کبھی باہر آ جاتے ہیں، اور ایک قسم کا گھونسلہ بھی بناتے ہیں، یعنی ایک تو اپنے رہنے کے لیے نرم تنکوں اور پتوں سے جس میں ایک طرف کو اندر جانے کا راستہ

ہوتا ہے، اور دوسرا گھونسلہ جھولے کی شکل کا ہوتا ہے۔ جب بادل گھر گھر کر آتے ہیں، اور ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے، سرد ہوا کے جھونکے چلتے ہیں۔ تو بیے چہچہاتے ہوئے ان ہنگھوڑے جیسے گھونسلوں پر پہنچ جاتے جھولا جھولتے ہیں۔

مجھے اس کی باتیں بہت دلچسپ معلوم ہوئیں۔ میں نے کہا، "سنا ہے بیے اپنے گھونسلوں میں روشنی کرنے کے لیے جگنو پکڑ کر گھونسلوں کے اندر تنکوں میں اڑس دیتے ہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا، "ہاں یہ درست ہے یہ بہت ہی سیانا پرندہ ہے۔"

اس پر میں نے اسے بندر اور بیے کی کہانی سنائی جو میں نے تیسری جماعت میں اردو کی کتاب میں پڑھی تھی۔ اس نے بچوں کے سے انہماک کے ساتھ وہ کہانی سنی، اور جب میں نے کہانی کا نتیجہ بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔

اس طرح بندر سے دوسرے جانوروں کا ذکر شروع ہوا۔ میں نے بتایا کہ جب میں سڑک پر سائیکل چلاتا ہوا آ رہا تھا۔ تو کس طرح مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں کسی جھاڑی میں سے کوئی بھیڑیا نہ نکل آئے۔

اس پر وہ پھر اپنے بے باک لہجے میں ہنسا۔ "نہیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں اس علاقے میں بھیڑیے بہت کم ہیں۔ تاہم کبھی کبھار دکھائی بھی دے جاتے ہیں۔ پھر اس نے بتایا کہ شیخو پورہ کے علاقہ کی آبادیوں سے پرے خونخوار بھیڑیے غول بنا کر گھوما کرتے ہیں، اور وہ قد میں گدھے سے کم نہیں ہوتے۔"

میں بہت حیران ہوا۔ میں نے پوچھا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر ادھر جا

ملتا ہوگا، تو بھیڑیے اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے ہوں گے۔

اس نے بڑا منہ پھیلا کر کہا: "ہاں ..... ایک مرتبہ ایک آدمی ادھر سے جا رہا تھا ..... میں نے یہ بات کسی سے سنی تھی ....."

"کیا وہ کوئی بڑا طاقت ور شخص تھا۔"

"ہاں وہ بہت تگڑا آدمی تھا ..... دوپہر کے وقت راستہ چلتے چلتے وہ تھک گیا تو ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ ایک جھاڑن میں روٹی بندھی تھی۔ اس نے روٹی کھائی اور پھر وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر تھوڑی دیر کے لیے اونگھ گیا۔ پھر یکایک اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کچھ عجیب عجیب سی آوازیں سنیں، اور اسے جھاڑیوں میں جانوروں کی تھوتھنیاں دکھائی دیں ....."

میں نے اچھل کر کہا: "وہ بھیڑیے ہوں گے، ہے نا؟"

"ہاں تم جانتے ہی ہو کہ بھیڑیے کا دہانہ بہت بڑا ہوتا ہے اس کے جبڑے خون کی طرح سرخ ہوتے ہیں۔ بھیڑیا بہت ہی مکار جانور ہے۔"

"پھر کیا ہوا" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بس بھئی، وہ آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ارد گرد کی جھاڑیوں میں بہت سے بھیڑیے بالشت بالشت بھر کی زبانیں نکالے چور نظروں سے اس کو گھور رہے ہیں ..... اسے محسوس ہوا کہ اب وہ بچ کر نکل نہیں سکتا۔ اس نے درخت کی طرف دیکھا تو اس کا تنا اس قدر چکنا تھا کہ اس پر پھرتی سے چڑھنا ..... ناممکن تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس پر چڑھنے کی کوشش کرے گا، تو بھیڑیے

اس پر جھپٹ پڑیں گے ۔۔۔۔ لمحہ بہ لمحہ بھیڑیے اس کے قریب چلے آرہے تھے، وہ
اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے، اور آہستہ آہستہ وہ اپنے گھیرے
کو تنگ کئے جا رہے تھے، زیادہ وقت باقی نہیں تھا، اس نے اِدھر اُدھر نگاہ
ڈالی، نہ کوئی لاٹھی نہ ہتھیار ۔۔۔ اتفاق سے قریب دو چار اینٹیں نظر پڑیں
معلوم ہوتا تھا، کہ کسی شخص نے کبھی اس جگہ اینٹوں کا چولہا بنا کر روٹی
پکائی تھی ۔۔۔۔ اس نے اپنی کھدر کی موٹی چادر کو دھرا کر کے پھرتی سے وہ
اینٹیں اس کے اندر رکھ کر انہیں گرہ دے دی، ابھی اس کے سر سے
ہاتھوں ہیں تھامے ہی تھے، کہ سب بھیڑیے ایک دم اس پر پل پڑے، اس
نے چادر میں بندھی ہوئی اینٹوں کو زور زور سے گھمانا شروع کر دیا جو بھیڑیا
اس کے قریب آتا اینٹیں اس کی تھوتھنی پر اس قدر زور سے لگتیں کہ وہ
گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا، بھیڑیے بڑھ بڑھ کر حملے کرتے رہے وہ بھی بڑی
پھرتی اور تندی کے ساتھ اینٹیں گھماتا رہا۔ اس طرح قریب آدھ گھنٹہ
تک وہ بھیڑیوں کے حملوں کو ناکام بناتا رہا ۔۔۔۔ یہاں تک کہ وہاں چند
راہگیر بھی آن پہنچے، انہوں نے دور ہی سے زور زور سے چلانا شروع کر دیا
بھیڑیے اس قدر شور و غل کی آوازیں سن کر بھاگ نکلے، اور اس آدمی
کی جان بچ گئی۔

یہ سنسنی خیز قصہ سنا کر وہ سانڈنی کو گالیاں دینے لگا، اور میں
اپنے خیالات میں کھو گیا ۔۔۔ زرد چاندنی کی پھیکی روشنی میں دور دور
تک کالے کالے درخت پھیلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، کہیں بہت

دور سے کسی کے گانے کی اڑتی ہوئی تان سنائی دینے لگی۔ سانڈنی اپنی بے ڈھنگی چال سے لپکی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک اونچے درخت کے قریب سے ہو کر گزرے جس پر خشک لوکیاں لٹک رہی تھیں۔ اس نے کلہاڑی کے دستے سے ایک لوکی کو ٹھکرا کر کہا۔ "دیکھو یہ ہے تونبی۔ بچپن میں جب ہم لوگ نہر پر نہانے جایا کرتے تھے، تو بس اسی قسم کی تونبی بغل میں دے کر اپنا مزے سے بوتل کے کاگ کی طرح تیرا کرتے تھے۔"

لیکن میرا دھیان ابھی تک بھیڑیوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے پھر بات چھیڑی۔ "کیا بھیڑیے بڑے آدمی پر بھی حملہ کر دیتے ہیں؟"

اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ اگر بھیڑیے تعداد میں زیادہ ہوں اور کوئی اکیلا دکیلا آدمی مل جائے تو وہ اس پر حملہ کر دیا کرتے ہیں لیکن عموماً آدمیوں سے ڈرتے ہیں۔۔۔ لو میں تمہیں ایک مزیدار قصہ سناتا ہوں۔۔۔ یہ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے۔۔۔ تقریباً چار برس پہلے کی بات ہے۔۔۔ میں اپنے ننھیال کو جا رہا تھا۔ راستے میں جنگل پڑتا تھا، لیکن مجھے پرواہ نہ تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک بڑی لمبی لاٹھی تھی، جس کے نیچے لوہے کی بڑی موٹی شام لگی ہوئی تھی۔ اگر اس لاٹھی کی ایک بھی ٹھکانے کی چوٹ کسی بھیڑیے کے سر پر پڑ جاتی تو وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ خیر! دوپہر کا وقت تھا۔ ابھی میں جنگل میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ میں نے چونک کر دیکھا کہ میرے دائیں ہاتھ کی طرف کوئی جانور جھاڑیوں میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ بائیں ہاتھ کی طرف جھاڑیوں

کے پیچھے ایک بھیڑیا کھڑا ہے ۔۔۔ میں چوکنا ہو کر راستہ طے کرنے لگا ، جس جگہ جھاڑیاں ذرا کم ہوتیں تو دیکھتا کہ میرے دائیں بائیں دو بھیڑیے تیس تیس یا چالیس پچالیس قدم کا فاصلہ دے کر چلے جا رہے ہیں ، میں نے لٹھ اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا ، اور ان پر نگاہ رکھتا ہوا بڑھتا چلا گیا تھا ، کبھی وہ میرے قریب آ جاتے اور کبھی پھر دور چلے جاتے جب ہم گھنی جھاڑیوں میں سے ہو کر گزرتے تو وہ نظروں سے غائب ہو جاتے ، مجھے اس وقت خطرہ محسوس ہوتا تھا ، کہ کہیں حملہ نہ کر دیں اور جس جگہ جھاڑیاں کم ہو جاتیں وہ دکھائی دینے لگتے ، اور ہاں ۔۔۔ ایک عجیب بات تھی ۔۔۔۔ کبھی دائیں ہاتھ والا بھیڑیا بائیں ہاتھ کی طرف چلا آتا اور بائیں ہاتھ والا دائیں ہاتھ کی طرف چلا جاتا اس طرح وہ راستہ بھر ادل بدل کرتے رہے ، یہاں تک کہ جنگل ختم ہو گیا ، لیکن ان کو مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی ، جنگل ختم ہونے پر میں تو آگے بڑھ گیا ، اور وہ جنگل ہی میں رہ گئے ،

جب وہ اپنا قصہ ختم کر چکا تو میں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی اب وہ مجھے بہت ہی دلچسپ آدمی معلوم ہونے لگا تھا ، اس کا لہجہ اس قدر دوستانہ تھا ، اور باتیں ایسی سنسنی پیدا کرنے والی اور مزے مزے کی کرتا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں ہی کرتا چلا جائے ، میں نے اصرار کیا کہ مجھے بھیڑیوں کی کوئی اور کہانی سناؤ ، وہاں قصوں کی کیا کمی تھی ، اس نے کہا ، اب میں تمہیں اپنے پر نانا کا چھوٹا سا قصہ سناتا ہوں ،

پر نانا یعنی میرے نانا کے باپ اپنے زمانے میں بہت ہی طاقت ور

شخص سمجھے جاتے تھے ، علاقہ بھر کے لوگ ان سے تھر تھر کانپتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے پرنانا اپنی پھوپھی سے ملنے کے لیے گئے ، وہاں انہیں کچھ کام تھا، ڈیڑھ دو ماہ وہیں رہے ، انہیں خبر ملی کہ گھر پر میرے نانا جو اس وقت بچے ہی تھے ، بیمار پڑ گئے ہیں خبر ملتے ہی پرنانا فوراً اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے ، جلدی میں انہوں نے اپنے ہاتھ میں لاٹھی تک نہ لی ، بیس پچیس میل کا فاصلہ تھا ، وہ بڑی تیزی سے چلتے تھے ، اس وقت چونکہ اپنے بیٹے کی بیماری کی فکر تھی ، اس لیے ان کی یہی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچ جائیں ، نصف راستہ طے کرنے کے بعد وہ ایک گاؤں کے قریب سے ہو کر گذرے تو اس گاؤں کے لوگوں نے ان سے کہا کہ وہ جس راستے سے جا رہے ہیں ، ادھر سے نہ جائیں بلکہ دوسرے راستے سے چلے جائیں ، دوسرے راستے سے بہت بڑا چکر پڑتا تھا ، اس لیے پرنانا اس راستے سے جانا نہیں چاہتے تھے ، انہوں نے سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اس راستے پر ایک بھیڑنی نے بچے دے رکھے تھے ، جو شخص ادھر سے گزرتا تھا ، وہ اس پر حملہ کر دیتی تھی ، چونکہ دوسرا راستہ بہت طویل تھا ، اور انہیں جلد از جلد پہنچنا تھا ، اس لیے انہوں نے لوگوں کے کہنے کی پرواہ نہ کی اور سیدھے راستے ہی سے جانے کی ٹھان لی ، جب کوئی ایک ڈیڑھ میل آگے نکل گئے تو دیکھا کہ عین راستے کے بیچ میں ایک خشمگیں بھیڑنی بیٹھی ہے ، وہ تھوڑا سا راستہ کاٹ کر گزرنے لگے تو اس نے ان پر حملہ کر دیا ۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کے جبڑوں کے پچھلے حصے میں جہاں دانت نہیں

ہوتے دونوں ہاتھ ڈال کر اس کا منہ پھاڑ دینے کی کوشش کی ادھر وہ بھنلائی لیکن زندگی اور موت کا سوال تھا، انہوں نے خونخوار جانور کو ٹانگوں میں جکڑ کر زور جو لگایا تو اس کا منہ پھاڑ ڈالا، وہ بہت تڑپی اور انہوں نے ایک بڑی سی اینٹ سے اس کو جان سے مار ڈالا۔۔۔"

مجھے اس قصے میں بہت مزا آیا، اس طرح ہم باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے، مگر اب میں کچھ تھک گیا تھا، جسم بھی دکھنے لگا تھا۔

دور سے درختوں کے جھنڈوں میں سے روشنی چھن چھن کر نکلتی دکھائی دی جب ہم اور قریب پہنچے تو باجوں اور ڈھول کا ہڑ کا ہڑ کا شور بھی سنائی دینے لگا۔ اس ویرانے میں یہ رونق! پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں میلا لگا ہوا ہے یہ بڑا میلہ سات دن تک مسلسل لگتا تھا۔ بڑی بڑی دکانیں اور بھانت بھانت کے کھیل تماشے آتے تھے، میں نے دریافت کیا "کیا اب میلے میں چلنا ہوگا۔"

"ہاں مجھے وہاں ایک ۔۔۔ سے ملنا ہے اور اس میلے کا مطلب ہی کیا ہے جہاں میل نہ ہو سکے ۔۔۔ کیا سمجھے!"

میں کچھ نہ سمجھا۔

اب ہم ایک چوڑے ریتیلے راستے پر ہو لیے۔ اس راستے کے دونوں کنارے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے، اور ان کناروں پر ببول کے اونچے اونچے درخت قطار در قطار میلے کے مقام تک چلے گئے۔

جب ہم قریب پہنچے تو کالے کالے درختوں کے تنوں کے بیچ میں سے گیس کے ہنڈے اور خیمے نظر آنے لگے، جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے تو

توں زیادہ رونق دکھائی دینے لگی ۔ حلوائیوں بساطیوں ، کمہاروں ، کھاد نے اور شربت نالودے والوں کی دکانیں ، ایک طرف اوپر نیچے گھومتے والے پنگھوڑے اور دوسری جانب بازوؤں پر نام یا پھول وغیرہ گودنے والوں کے اڈے ۔ گھوڑے ، گدھے ، تانگے ، چھیلے بیل اور اونٹ بھی نظر آنے لگے ۔ اس وقت خوب گہما گہمی ہو رہی تھی ۔ مردوں اور عورتوں کے جھلڑ کے جھلڑ اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے ۔ روشنی اور گانے بجانے کی وجہ سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا ۔

میلے میں پہنچ کر ایک درخت کے تلے میرے ساتھی نے سانڈنی کو زمین پر بیٹھا دیا ۔ میں اتنا تو میری ٹانگیں سن ہو گئیں تھیں ۔ میں کھڑا نہ رہ سکا ۔ اس لئے فوراً زمین ہی پر بیٹھ گیا ۔ وہ میری طرف دیکھ کر دانت نکال کر ہنسا " کیوں بس تھک گئے ؟ "

میں کچھ جھینپ سا گیا ۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میرے جسم کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا ۔

اس نے پوچھا " تمہیں بھوک تو لگی ہو گی خوب زوروں کی ؟ "

میرے اثبات میں جواب دینے پر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر حلوائی کی سب سے بڑی دکان پہ پہنچا ۔ کڑاہے آگ پر چڑھے ہوئے تھے ۔ گرما گرم جلیبیاں اتر رہی تھیں ۔ پہلے تو اس نے مجھے گرم گرم جلیبیاں دلوائیں ۔ مجھے بھوک بھی تیز لگ آئی تھی ۔ اس دن جلیبیاں کھانے کا بڑا لطف آیا ۔ اس نے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا " بس اب تم جو جی چاہے کھاؤ "

خوب پیٹ بھر کر، کھے ا"

مجھے دکان پر چھوڑ کر وہ خود ایک طرف کو چل دیا۔ میں نے جو جی چاہا کھایا۔ جب کھا چکا تو حلوائی کے نوجوان لڑکے نے دام طلب کئے۔ میں بڑا گھبرایا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ میرا ساتھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اب میں خوب پھنسا۔ میں نے حلوائی سے کہہ دیا کہ میرے پاس دام نہیں ہیں۔ اس پر نوجوان حلوائی نے کہا کرسی پر بیٹھے رہو جب تک پیسے نہیں دو گے یہاں سے ہرگز نہیں جا سکتے دو دھنگا۔ میں بہت پریشان ہوا۔ تھوڑی سی دیر بعد حلوائی پھر بکواس کرنے لگا۔ میں ڈرا کہ کہیں دو چار چپت ہی نہ جما دے ... اتنے میں بطخ کی چونچ کی سی ناک والا میرا ساتھی بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا آن پہنچا۔ اسے آتا دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اس وقت حلوائی کا لڑکا مجھے کھری کھری سنا رہا تھا۔ میرے ساتھی نے آتے ہی بڑی زوردار آواز میں اسے للکار کر کہا "لے او حرامی کے پلے! ... کیا کہتا ہے ہمارے چھوکرے کو ... ؟"

پھر اس نے آگے بڑھ کر ٹیٹوا دبا لیا۔ "برخوردار میرا نام جیتا سنگھ ہے جیتا سنگھ ..." شور سن کر لڑکے کا باپ ہاتھ جوڑ کر دکان سے نیچے اتر آیا۔ اور جیتا سنگھ کے سامنے روتی صورت بنا کر کھڑا ہو گیا۔ "لالہ جانتے ہو میں کون ہوں ؟"

لالہ ہانپ رہا تھا۔ مٹکے کی طرح پھولا ہوا اس کا پیٹ نیچے اوپر ہو رہا تھا۔ "جی ان داتا جانتا ہوں ..."

جیا سنگھ نے اس کے جوان لڑکے کو گردن سے پکڑ کر اس زور سے پیچھے دھکیل دیا کہ وہ گرم گرم گھی کے کڑاہے میں گرنے سے بال بال بچا۔ "تو پھر اپنے اس نوٹیسے کو بھی بتا دو۔ کہیں مجھے اس کا بھرکس نہ نکالنا پڑے۔۔۔۔ کیوں بے سور تجھے اتنی جرأت کیونکر ہوئی کہ تو ہمارے لڑکے پر پیسے لینے کے لیے چڑھ دوڑا۔۔۔" وہ لال لال آنکھیں نکالے لالہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کے لوگ بھی آن جمع ہوئے، لالہ نے کدو سا سر ہلاتے ہوئے کہا "جی میں نے پیسے نہیں مانگے۔۔۔ اجی مجھے تو معلوم بھی نہیں ہوا اس حرامزادے نے کب پیسے مانگنے شروع کر دیئے۔"

جیا سنگھ نے کہا "خون پی لونگا خون۔۔۔ یہاں انگریز کا راج نہیں میرا راج ہے۔۔۔ کہو تو دکان برابر کر دوں صبح تک۔"

اتنے میں ایک اور قد آور مسلمان نوجوان آگے بڑھا "ایہ جانے دے یار غلطی ہو گئی بیچارے سے۔" جیا سنگھ نے گھوم کر دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں، دونوں بغل گیر ہو گئے۔ شاید بہت دنوں بعد دونوں دوستوں کا ملاپ ہوا تھا۔ نووارد بھی ایک خونخوار گدھ کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

حلوائی کو اتنی تنبیہ ہی کافی سمجھی گئی۔ اس کے بعد ہم لوگ میلے میں گھومنے لگے، وہ دونوں بہت دیر تک مقدموں، پولیس اور تھانے وغیرہ کی باتیں کرتے رہے۔

میلے سے ذرا ہٹ کر ایک جگہ کھلے کھیت میں الغوزے بج رہے تھے، لوگ ایک بڑے گھیرے میں بیٹھے تھے، حقے کا دور چل رہا تھا۔ کچھ لوگ لاٹھیاں

بغلوں میں دبائے ان کے سہارے سج میں کھڑے تھے۔ بعض لاٹھیوں پر ٹھڈیاں ٹکائے اچکے ہوئے کھڑے تھے۔ الغوزے بجانے والے کے قریب ایک گبھرو ہاتھ کان پر دھرے بڑے مزے میں پورن بھگت کا قصہ گاگا کر سنا رہا تھا۔ ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف گانے والے کی درد میں ڈوب ڈوب کر اُبھر آنے والی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ جب گانے والا ایک بول کہہ کر خاموش ہو جاتا تو الغوزوں کی لہکتی ہوئی دلکش آواز دو بولوں کے درمیانی وقفہ کو اور بھی دلکش بنا دیتی۔

ایک اور جگہ بہت بھیڑ تھی۔ خوب ہلڑ مچا ہوا تھا۔ جب ہم قریب پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں نے ایک رنگین مزاج سرمست بوڑھے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بوڑھے کی سپید داڑھی اور لمبے لمبے پٹے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ پہلے وہ ایک لمبی سی ہانک لگا کر بڑی لے کے ساتھ کوئی عریاں سی بولی سناتا۔ لوگ قہقہے لگاتے اور وہ ہاتھ اٹھا کر چٹکیاں بجاتا اور کہنیاں ہلاتا ہوا اچھل اچھل کر رقص کرتا تھا۔ اس کے منہ میں ایک دانت تک نہ تھا لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ پھر اس نے بڑی شوخ نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں پکار کر بولا۔

اوے۔۔۔ نالے بابا کھیر کھا گیا۔
نالے دے گیا دانی کھوٹی

ہونہو
"بلے اوئے بابیا" ہر طرف سے تحسین اور آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔

ہم اسی طرح گھومتے پھرتے چلے جا رہے تھے، جبا سنگھ اور اس کا دوست عقابوں کی طرح آگے کو جھک جھک کر تالیاں بجاتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے، میں ان کی لمبی لمبی ٹانگوں پر نگاہ رکھتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اتنے میں جبا سنگھ میری طرف مخاطب ہوا۔ "کاکا۔۔ کیا نام ہے تمہارا۔۔"

میں بکری سنگھ کہنے ہی کو تھا کہ یکایک رک گیا، ورنہ میرا خوب مذاق اڑایا جاتا۔ میں نے سنبھل کر اصلی نام بتا دیا۔

تم نے کبھی اونٹنی کا دودھ پیا ہے۔۔۔ اہا! بہت ٹھنڈا ہوتا ہے، آؤ تمہیں ایسا دودھ پلائیں کہ بس یاد ہی کیا کرو گے۔

ہم میلے سے ذرا پرے ہٹ آئے، ایک جگہ بہت سی اونٹنیاں بندھی ہوئی تھیں، ادھر ادھر کھلے میدان میں چارپائیاں بچھی ہوتی تھیں، اور ان پر میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے آدمی بیٹھے دکھائی دے رہے تھے، روشنی کی کمی کی وجہ سے ان کے چہرے صاف طور پر نظر نہ آتے تھے۔ ہم بھی ایک چارپائی پر جا بیٹھے، جبا سنگھ نے اپنے سامنے دودھ رکھایا، اور پھر تین ٹنڈیں دودھ کی بھری ہوئی لایا۔ وہ دونوں تو اپنی اپنی ٹنڈیں ایک ہی سانس میں چڑھا گئے، لیکن میں باوجود شدید پیاس کے تین ساڑھے تین سیر کی ٹنڈ پی نہ سکا۔۔ چنانچہ جبا سنگھ میری ٹنڈ کا دودھ بھی پی گیا۔ وہاں سے اٹھ کر ہم پھر میلے میں واپس چلے آئے۔ ہم بہت دیر تک گھوم چکے تھے اردگرد کے دیہات سے آئی ہوئی عورتیں بھی واپس جا رہی تھیں، اگرچہ اب رونق کافی تھی لیکن جہاں تک عورتوں کا تعلق تھا، محفل پہلے کی نسبت کچھ سرد پڑ چکی تھی۔

ایک طرف مجرے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، ایک سفید ریش بزرگ سیاہ کپڑے پہنے تخت پوش پر جلوہ افروز تھے، دانتوں میں حقے کی نے دبی تھی ادھر اُدھر عقید تمندوں کا جمگھٹا تھا، چند نوجوان عورتیں ہار سنگار کرنے کے بعد پاؤں میں گھنگرو باندھ رہی تھیں طبلے پر آٹا ملا جا رہا تھا، کچھ وقفے کے بعد تھپ تھپ تھاپ کی آوازیں سنائی دینے لگیں، ایک طرف سارنگی نواز بیٹھے سارنگیوں کے کان مروڑ رہے تھے، ادھر ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے گز ہلتے اور ادھر ان کے بڑے بڑے پگڑوں والے سر بھی بڑی آہنگی کے ساتھ حرکت کرتے سب لوگوں کی نگاہیں ان عورتوں پر جمی ہوئی تھیں، جو بل کھا کھا کر سو سو طرح سے اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی تھیں، وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ سیاہ پوش پیر کی سرگیں آنکھوں سے لے کر معمولی سے معمولی شخص کی آنکھوں تک سب انہی کی شیدائی تھیں،

جسا سنگھ کے دوست نے مجرا دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا، جسا سنگھ کا بھی خیال تو یہی تھا لیکن شاید میرے خیال سے اس نے وہاں زیادہ دیر تک رکنا مناسب نہیں سمجھا، اس لیے وہ دوست سے رخصت ہوا، اور ہم لوگ اپنی سانڈنی کی نکیل پکڑ کر میلے سے چل نکلے،

جب ہم میلے سے باہر آگئے تو سامنے پھر گھنی گھنی جھاڑیاں اور اونچے اونچے درخت تھے، ہمارے دائیں بائیں اب بھی کوئی اکا دکا خیمہ نظر آ ہی جاتا تھا، تھوڑی دور جانے کے بعد جسا سنگھ رک گیا،، اس نے مجھے وہیں ٹھہرایا اور سانڈنی کی مہار میرے ہاتھ میں دے کر خود اس ریتلے راستے

کے اونچے کنارے کی طرف رُخ کر کے تن کے ایک اور درخت کے قریب پہنچا،

وہ درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ درخت کے سائے میں ایک نوجوان عورت تنے کی اوٹ میں سے باہر نکلی، وہ دونوں ہنس پڑے اور بہت آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے،

مدھم روشنی میں اس عورت کی صورت صاف طور پر نظر نہیں آتی تھی، البتہ جب وہ باتیں کرتی ہوئی اپنی جگہ سے ایک طرف کو ہٹ جاتی تو چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کے خطوط صاف صاف دکھائی دینے لگتے،

وہ ایک خوب پلی ہوئی جنگلی بلی کی مانند تھی، اس کے چلنے کا انداز بھی اسی موٹی تازی بلی کی طرح تھا جو پیٹ بھر کر چوہے کھا لینے کے بعد خر خر کرتی ہو، غیب کھینچی تنی ہوئی وہ ٹھسا ٹھس گوشت کا تڑپتا ہوا ایک مکڑا تھی۔، جیسے خربوزے کی قاش یا میٹھے سنگترے کی رس بھری پھانک، اس نے گہرے نیلے رنگ کی اوڑھنی کی ڈھاٹا جھی بکل مار رکھی تھی، جس میں سے اس کا صرف چہرہ ہی نظر آتا تھا، اگر اس کے صحت ور گالوں پر اس قدر گوشت نہ ہوتا اس کی آنکھیں خوب بڑی بڑی دکھائی دیتیں، ابرو لچکتی کٹار تھے اور دانت صاف و شفاف اور آبدار اخروٹ کے درخت کی چھال سے رنگے ہوئے مسوڑھوں میں سے ہنستے وقت اس کے دانتوں کی چمک بجلی کی طرح کوند جاتی تھی، اس کے ہونٹوں میں سمندر کی لہروں کا سا مدو جزر پیدا ہوتا اور وہ گرم ریت پر پڑی ہوئی کسی مچھلی کی طرح پیچ و تاب کھانے لگتے تھے،

وہ دونوں مجھ سے کچھ فاصلے پر تو تھے ہی، پھر وہ باتیں بھی بہت دھیرے دھیرے کر رہے تھے، کم از کم میرے کان میں کچھ نہیں پڑنے دیتے تھے البتہ عورت کے ہونٹوں کے اتار چڑھاؤ اور پیچ و خم سے معلوم ہوتا تھا کہ مضامین کے دفتر کے دفتر کھولے جا رہے ہیں۔۔۔ کبھی شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر ٹھینگا دکھانے کے انداز میں اوپر والا ہونٹ بھینچ کر نیچے کا ہونٹ آگے بڑھا دیتی۔۔۔۔ اس نے اپنی چیدریا کو سنوارا تو اس کے سیاہ گھنے اور لمبے بال بارش کی بوچھاڑ کی طرح باہر نکل پڑے، اس کی خوش وضع گردن کی جھلک بھی لمحہ بھر کو دکھائی دی، اور پھر اس کی بادل نما اوڑھنی میں روپوش ہو گئی، وہ مستی میں آئی ہوئی کبوتری کی طرح اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔۔ جبا سنگھ نے غالباً اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا، عورت نے نرمی سے اس کا ہاتھ راستے ہی میں روک دیا اور بڑے بانکپن سے ٹھمک کر سپردگی کے انداز میں اس کے قریب ہو گئی، اور اس کے کان کے پاس سرگوشی میں کچھ کہا، جبا سنگھ نے میری طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس ۔۔۔ پھر جبا سنگھ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پتوں میں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی میں عورت کی تیز آنکھوں میں سے روشنی کی شعاعیں سی نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ اور جب جبا سنگھ واپس لوٹا تو وہ درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور کچھ غمناک آنکھوں سے جبا سنگھ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی اس کا ایک گال درخت کے تنے سے لگا ہوا تھا۔

ہم بدستور سابق سانڈنی پر سوار ہو گئے، اور سانڈنی پہلے کی طرح بے ڈھب چال سے بھاگ نکلی، کافی دور آ جانے کے بعد میں نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا وہ عورت ابھی تک اسی طرح درخت کے تنے کے ساتھ سمٹ کر کھڑی ہوئی تھی،

جب ہم کھیتوں میں پہنچ گئے، تو جسا سنگھ نے اپنا بٹوے جیسا منہ کھول کر میری طرف دیکھا، اور ناک کی بجائے منہ سے سانس لینے لگا، اس کی چھوٹی موٹی مونچھوں کے تلے اس کے کچھ بھدے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھیل رہی تھی، بھاری سی آواز میں بولا " کیا سوچ رہے ہو "

میں کچھ جھینپ سا گیا۔

سانڈنی نچلا ہونٹ آگے کو بڑھائے کسی روٹھی رانی کی طرح ٹھمک ٹھمک کر چلی جا رہی تھی، جسا سنگھ نے لوہے کے کڑے والا ہاتھ اٹھا کر کان پر رکھ لیا ایک لمبی ہانک لگائی، اس کے منہ میں سے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ زندگی سے بھرپور آواز نکلی جو فضا میں پھیلتی چلی گئی، اس قدر آزاد اور بھرپور آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی، اس کی آواز میں موسیقی نہ سہی، لیکن ایک ایسی کشش، ایک ایسا خلوص اور کرارا پن تھا، جس پر سنگیت سے بھرپور ہزاروں آوازیں قربان کی جا سکتی تھیں، لمبی ہانک کے بعد وہ گانے لگا،

ادے

میں مل لاں تخت لاہور دا (میں لاہور کے تخت پر قبضہ جما لوں)

میں کھوہ لاں راجے دیاں رانیاں (میں راجے کی رانیاں چھین لوں)

ادے۔ ہو ہو

پھر اس نے بلند قہقہہ لگایا۔ لو میں تمہیں ایک اور گانا سناتا ہوں۔

بہت مزے کا گیت ہے، ایک عورت جس کا نام بھاگن ہے اپنے ۔۔ یعنی سمجھے نا!

اس سے پوچھتی ہے۔

"ہیں وے کتھے چلے او"

"ہاں لے حاکم کہاں چلے ہو تم، تم کہاں چلے ہو۔

حاکماں تسی تسی وے کتھے چلے او

اب حاکم جواب دیتا ہے

ہے نی دِلی چلے آں

"بھاگنے! اسی، اسی نی دِلی چلے آں"

اِس پر بھاگن کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے ہیں۔ کہتی ہے

"ہیں وے کی لیا دو گے

حاکماں! تسی تسی وے کی لیا دو گے

بھلا حاکم بھاگن کے لیے کچھ لانے سے کب چوک سکتا تھا لیکن اس

موقع پر اسے شرارت سوجھتی ہے، وہ اصل تحفے کا ذکر تو کرتا نہیں بلکہ

کہتا ہے۔

"ہیں نی! بلی لیا داں گے

"بھاگنیں! اسی، اسی نی بلی لیا داں گے"

بلی کا نام سن کر بھاگن کا جی کٹ جاتا ہے۔ تیور بگڑ جاتے ہیں۔ پوچھتی

ہے۔

بلی کی گر ہے گی

حاکماں! بلی، بلی وے کی گر ہے گی۔

حاکم کنکھیوں سے بھاگن کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے برہم ہو جانے

سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ہے نی نہو ندر مارے گی

بھاگنیں! بلی، بلی نہو ندر مارے گی۔

بھاگن اس بات پر بظاہر مسرت کا اظہار کرتی ہے اور پھر طنزاً پوچھتی

ہے۔

پٹی کون بنھے گا۔

حاکماں! پٹی، پٹی وے کون بنھے گا۔

اب حاکم کی باری تھی۔ بھاگن سمجھتی تھی کہ اب حاکم سے کوئی بات نہ بن

پڑے گی۔ اب حاکم نے پہلے تو بھاگن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرما

گئی۔ جب شرم کے مارے بھاگن کے رخسار سرخ ہو گئے تو اس نے کہا۔

پٹی تو ں بنھیں گی۔

بھاگنیں پٹی پٹی نی توں بنھیں گی۔

اوہو ہو ہو

"کیوں میرا گانا پسند آیا؟"

گانا تو جیسا ہو تھا سو تھا ہی لیکن گاتے میں جو زندگی اور للکار اور اس کے انداز میں جو بے باکی تھی وہ مجھے بہت پسند آئی ۔

اس نے پوچھا "تم بھی گانا جانتے ہو؟"

میں گانا نہیں جانتا تھا ، کاش میں اسے گانا گا کر ہی سنا سکتا ۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں پوچھا وہ مسلمان کون تھا ؟"

وہ ہنس پڑا ! "وہ میرا جگری دوست ہے سمجھے ، بڑے عرصے کے بعد بڑے گھر سے آیا تھا ۔ اچھا ہی ہوا جو مجھے مل گیا ۔"

"بڑا گھر کیا ہوتا ہے ؟"

"ارے تم بڑا گھر نہیں جانتے ، ہائے افسوس تم بڑے گھر کبھی نہیں جا سکو گے ، صرف بڑے آدمی ہی بڑے گھر میں جا سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بس سرکار بہادر ، یہ سمجھ لو کہ بڑا گھر صرف انہی لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو سرکار کی خدمت کرتے کرتے تھک جاتے ہیں ، تو انہیں آرام کرنے کے لیے بڑے گھر میں بھیجا جاتا ہے ، وہاں وہ اطمینان سے بیٹھ کر سرکار اور پرجا کی سیوا کے نئے نئے ڈھنگ سوچا کرتے ہیں ، چنانچہ جب آرام کرنے کے بعد سرکار کے بڑے گھر سے نکلتے ہیں تو پھر نئے نئے طریقوں سے بڑے زور شور سے پرجا کی سیوا کرتے ہیں پرجا سرکار سے ان کی پر زور سفارش کرتی ہے ، سرکار جتنی زیادہ خوش ہوتی ہے اتنی ہی جلدی ان سیوکوں کو بڑے گھر میں بھیج دیتی ہے جو شخص جتنی زیادہ تندہی کے ساتھ خدمت کرتا ہے ، اتنے ہی زیادہ عرصے کے لیے اسے آرام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے ۔"

میں بہت دیر تک اپنی عقل کے مطابق بڑے گھر کی بابت سوچ بچار کرتا رہا۔ جسا سنگھ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا میرے اس دوست کا نام نورا ہے اس کے بڑے گھر میں جانے سے پہلے ایک مرتبہ ہم دونوں ایک گاؤں میں رات کے وقت کسی کے گھر میں گھس گئے، ہر طرف سناٹا تھا، ہم ہر آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھے۔ کوئی غیر معمولی آواز سنائی نہ دی، لیکن جب ہم باہر نکلنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جس مکان کے اندر ہم گھسے ہوئے تھے، اسے گاؤں کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے ۔ ۔ ۔"

آپ لوگ اس گھر میں گھسے ہی کیوں تھے۔

"اوہو! دیکھو ننھے ایسی باتوں میں لوکنا اچھا نہیں ہوتا، بس تم یہ سمجھ لو کہ کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی وجہ سے کسی نہ کسی شخص کے گھر کے اندر گھس گئے تھے، گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں گھر والوں کی نیند کیسے کھل گئی اور وہ سب گاؤں والوں کو کس وقت بلا لائے ۔ ۔ ۔ اتنے آدمیوں کا اجتماع دیکھ کر ہم بہت گھبرا گئے۔ چپکے سے دبک کر بیٹھ رہے سوچتے تھے کیونکر صحیح وسالم باہر نکلیں، کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، پھر یہ بھی کھٹکا لگا ہوا تھا کہ یہیں پڑے پڑے صبح نہ ہو جائے، یا پھر وہ لوگ کہیں سے پولیس ہی کو نہ بلا لائیں۔ چنانچہ ہم دونوں نے مشورہ کیا، اور ایک دوسرے کی پیٹھ کی طرف پشت کر کے باہر نکلے تو دیکھا کہ وسیع صحن اور گلی میں آدمی ہی آدمی کھڑے ہیں۔ لاٹھیاں ہمارے ہاتھوں میں تھیں، بس ہم نے لاٹھیاں چلانی شروع کر دیں، ہماری جان پر بنی ہوئی تھی، اس قدر جانکاہی سے ہم نے

آج تک لاٹھی نہیں گھمائی تھی، لوگوں میں ہلچل پیدا ہو گئی، لاٹھیوں کی زد سے بچنے کیلئے وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ایک بھاگا تو بھگدڑ مچ گئی، لیکن جب ان لوگوں نے دیکھا کہ ہم تعداد میں صرف دو ہی ہیں تو پھر ان کا حوصلہ بڑھا، اور وہ لپک لپک کر ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم بھی لہو لہان ہو گئے، ان کے گھیرے میں سے نکل کر جو ہم بھاگے تو آٹھ کوس تک بھاگتے ہی چلے گئے تاکہ وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر ہمیں گھیر نہ لیں ۔۔۔۔ سمجھے میرا ہی دوست میرے ہمراہ تھا، اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہیں پر ان تیاگ دیتا۔"

مجھے بہت تعجب ہوا، کیا سارے گاؤں میں ایک بھی شخص ایسا نہ نکلا جو آپ کا مقابلہ کر سکتا؟

"کہاں بھیا! ہمارا مقابلہ کرنے کیلئے تو ان پاس پڑوس کے گاؤں میں سے بھی کوئی نہیں نکل سکتا تھا، ہاں اگر کہیں میرے ماموں جیسا کوئی آدمی ہوتا وہاں تو پھر ہماری دال نہیں گل سکتی تھی۔

کیا آپ کے ماموں بہت طاقتور شخص ہیں۔

"طاقتور ۔۔۔ میرے ماموں اس قدر طاقتور شخص ہیں کہ اِدھر اُدھر کے لوگ انہیں "دیو" کہتے ہیں۔ بڑا اچھا ڈیل ڈول ہے ان کا۔ قد میں تو خیر مجھ سے بھی کچھ کم ہی ہیں لیکن ان کی للکار ہی ایسی زوردار ہوتی ہے کہ کسی شخص کی ہمت نہیں پڑتی کہ ان کے سامنے سر بھی اٹھا سکے، ان کا علاقے بھر میں بڑا دبدبہ ہے۔۔۔

"کیا وہ کبھی چوروں کے ساتھ بھی لڑا کرتے ہیں، کبھی کوئی ڈاکو پکڑا انہوں نے؟

"انہوں نے بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں، تمہیں میں ان کی زندگی کا ایک چھوٹا

سا بہت ہی دلچسپ واقعہ سناتا ہوں، ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں رات کے وقت وہ گاؤں سے باہر مویشیوں کے باڑے کے پھاٹک کے قریب چارپائی ڈالے سو رہے تھے ان کے سب مویشی باڑے کے اندر بند تھے، اتنے میں وہاں چور آ نکلے اور انہیں گہری نیند میں مدہوش پاکر اندر گھس گئے، اور بیلوں کی ایک بہت عمدہ جوڑی نکال کر چل دیئے، ابھی وہ بیل ہانکتے ہوئے کوئی چالیس پچاس قدم ہی گئے ہوں گے کہ دفعتاً میرے ماموں کی آنکھ کھل گئی، اور وہ فوراً بھانپ گئے کہ چور ان کے مویشی لئے جا رہے ہیں، وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پکار کر بولے: بھئی تم جو کوئی بھی ہو۔۔۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔۔۔ تم میرے مویشی تو لیے جا رہے ہو بڑی خوشی سے لیجاؤ، لیکن اتنی بات یاد رہے کہ تم انہیں جہاں کہیں بھی لیجاؤ گے کل کے دن کے اندر اندر اگر میں اپنے مویشی واپس نہ لے آؤں تو میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں۔۔۔ اور یہ بھی سن لو کہ میرا نام دسوندھا سنگھ ہے۔

وہ آدمی کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑے مشورہ کرتے رہے، پھر ان میں سے ایک شخص بلند آواز میں بولا، دسوندھا سنگھ سردار! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ تمہارے بیل ہیں، نہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ چارپائی پر تم ہی سوئے پڑے ہو، ہم نے تمہارا نام سن رکھا ہے، اس لیے ہم یہ بیل اسی جگہ چھوڑے جاتے ہیں! چنانچہ انہوں نے دونوں بیل باڑے کی طرف ہانک دیئے اور خود اپنی راہ پر روانہ ہو گئے۔

مجھے اس کی باتیں سننے میں بڑا مزا آ رہا تھا، خاموش رات میں سانڈنی کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن میں اس کی گونجتی ہوئی آواز ایک خاص کشش رکھتی تھی، میں اس سے کوئی بات دریافت کرنے ہی لگا تھا کہ ایک بڑے ہندو کی پھنکار

سنائی دی، دیکھا تو پرے ایک اونچی سی جگہ پر ایک پھن دار سانپ پھن اٹھائے لہرا رہا ہے

میرے جسم میں بجلی کی ایک وس دوڑ گئی، جسا سنگھ نے سانڈنی روک لی۔

کچھ دیر تک وہ سانپ کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ سانپوں کا راجہ "ناگ" ہے، اُف کس قدر

کالا ہے، اگر یہ کسی کو کاٹ لے تو اسے پانی مانگنے کی مہلت نہ ملے۔"

پھر اس نے مجھے سانڈنی پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود نیچے اتر گیا۔ سانپ

ابھی تک پھن اٹھائے لہرا رہا تھا۔ جسا سنگھ کے کندھے سے چادر اتار کر بائیں ہاتھ

میں پکڑ لی اور داہنے ہاتھ میں لاٹھی لیکر وہ آگے بڑھا، وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا

تھا، اس وقت وہ ایک اصیل مرغ کی طرح چوکنا ہو رہا تھا، اس کی گھنی بھوؤں تلے اسکی

تیز آنکھیں چمک رہی تھیں اس نے اپنا لوہے کا کڑا کلائی سے پیچھے ہٹا کر بازو پر پھنسا

لیا، سانپ کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور سانپ کی نظروں سے نظریں ملا کر کھڑا ہو گیا،

میں ڈر گیا، میں نے اسے آواز دے کر واپس چلے آنے کے لیے کہا لیکن اس نے میری طرف

دیکھے بغیر چپ رہنے کا اشارہ کیا، اور خود سانپ کے اور بھی نزدیک چلا گیا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر دیکھا کوئی آدمی، جانور یا پرندہ نظر نہیں آتا تھا۔

چاند کی روشنی اب کچھ تیز ہو گئی تھی، ببول کے درخت چپ چاپ کھڑے تھے، ان کی شاخوں

کی نازک کونپلیں تک ساکن تھیں، وہ ایسی بے اعتنائی کے ساتھ کھڑے تھے جیسے انہیں

اس بات سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ اس سنسان مقام پر انسان اور ناگ کا مقابلہ

میرے لیے ایک نئی اور عجیب شے تھی، مجھے یقین تھا کہ سانپ دھوکے سے جسا سنگھ

کی ننگی ٹانگ پر دانت مارے گا، اور وہ اسی وقت تڑپ تڑپ کر مر جائے گا، میرا

حلق خشک ہو رہا تھا، میں چاہتا تھا کہ وہ واپس چلا آئے لیکن وہ میری بات سنتا ہی

کب تھا۔ اب وہ عورت بھی بہت پیچھے رہ گئی تھی، ورنہ میں بھاگ کر اسے ہی بلا لاتا۔ وہ تو اسے روک سکتی تھی۔

جسا سنگھ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اس وقت ایک چنچل بچے کی طرح ضدی اور کھلنڈرا دکھائی دے رہا تھا۔ سانپ کے قریب کھڑے ہو کر وہ ایک کر اپنا تہبند اس کے پھن کے قریب ہلانے لگا۔ سانپ نے بھی پھن بڑھا بڑھا کر دو تین مرتبہ اسے کاٹنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ جو اس نے ذرا بڑھ کر چادر اس کے قریب کی تو بڑھ کر سانپ اچھل کر چادر سے لپٹ گیا۔ جسا سنگھ نے چادر زمین پر پھینک کر اسے لاٹھی سے پیٹنا شروع کیا۔ ایک لمحہ کیلئے سانپ اس کے پاؤں کے قریب دکھائی دیا۔ پھر وہ بھاگ نکلا۔ جسا سنگھ بھی اچھل کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ پھر وہ ہموار ریتلی زمین پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے۔ سانپ پلٹ پلٹ کر اس پر حملے کرتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بہت دور نکل گئے۔ جسا سنگھ کی لاٹھی بار بار ہوا میں بلند ہوتی تھی، اور پھر دفعتاً جسا سنگھ زمین پر گر پڑا ۔۔۔۔ اٹھا اور پھر گر پڑا ۔۔۔۔ میرا دھڑکتا ہوا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ شاید عورت جس سے وہ تھوڑی دیر پہلے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ ابھی تک درخت کے تنے کے ساتھ لگی ہو ۔۔۔ جسا سنگھ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا میرے قریب آیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا سانپ نے آپ کو کاٹ کھایا تھا۔"

"نہیں تو۔" وہ ہنس کر بولا۔ "وہاں گیلی زمین تھی۔ میرا پاؤں رپٹ گیا۔ دیکھو یہ میرا کچھا بھی کیچڑ میں خراب ہو گیا ۔۔۔ گر کر میں اٹھنے لگا تو پھر گر گیا ۔۔۔"

"تو سانپ بھاگ گیا؟"

"بھئی نہیں سانپ کو بھاگنے بھی دیتا ہیں تم جانتے نہیں اگر یہ سانپ ایک مرتبہ زخمی ہو کر بچ نکلے تو اپنے دشمن سے انتقام ضرور لیتا ہے اسی لیے میں اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ اب تو میں نے اس کا سر اچھی طرح کچل کر رکھ دیا ہے ۔۔۔ آؤ نیچے اترو تمہیں بھی سانپ دکھلائیں۔

جب ہم مرے ہوئے سانپ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ کم از کم چھ ہاتھ لمبا سانپ تھا، پیٹھ بالکل سیاہ تھی، پیٹ سفید مائل تھا۔ بل کھایا ہوا مردہ سانپ اب بھی اس قدر خوفناک دکھائی دیتا تھا۔ کہ اس کے نزدیک جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

اس بات کی مزید تسلی کر لینے کے بعد کہ سانپ واقعی قطعاً مر چکا ہے ہم واپس آ کر سانڈنی پر سوار ہو گئے۔

میں نے زندگی میں اس قسم کے سنسنی خیز واقعات کم ہی دیکھے تھے۔ مجھے ابھی تک پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ جبا سنگھ کی جسارت احمقانہ حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لیکن وہ پورے وثوق کے ساتھ نیچے اترا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ سانپ کو مار ڈالے گا۔ لیکن میں رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ اگر کہیں سانپ جبا سنگھ کو کاٹ ہی کھاتا تو کیا ہوتا

جبا سنگھ نے سانڈنی کو شکار کر ہانکتے ہوئے کہا۔ یہ سانپ بہت ظالم ہوتا ہے یہ گائے کا تھن منہ میں لے کر دودھ پی جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ انسان ذات کا دشمن بن بیٹھتا ہے۔ اس وقت اس کی کارستانیاں بہت بڑھ جاتی ہیں، جو آدمی دکھائی دے اسے کاٹنے سے نہیں چوکتا۔ ایسا سانپ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے، اور پھر سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ یہ جانور بھی چھوٹا سا ہوتا ہے اور ہے بہت چالاک اور

اس کو مار ڈالنا بھی آسان نہیں۔ بس ایسے سانپ سے واہگورو ہی بچائے۔
اسی طرح باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ جیا سنگھ نے کہا "لو، یہ سامنے تمہارا ہی گاؤں ہے نا۔"

میں اس کی باتوں میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے اِدھر اُدھر کا کچھ خیال ہی نہ رہا تھا۔ اب ہم گاؤں کے قبرستان کے قریب سے گزر رہے تھے، جھڑبیریوں کے بیچ میں ابھری ابھری قبریں چاندنی رات میں اور بھی زیادہ بھیانک دکھائی دے رہی تھیں۔ سامنے نیم کے درختوں کے تلے چاروں کا کنواں بھی نظر آ رہا تھا۔ کنوئیں کی چرخی تاریکی میں کسی نقاب پوش آدمی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں سے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جہاں دن کے وقت مرغیاں اور ان کے ننھے ننھے چوزے پنجوں سے زمین کریدتے پھرا کرتے تھے۔ پرے چھوٹے چھوٹے درختوں کا جھنڈ تھا جو ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے چور گاؤں میں گھسنے سے پہلے آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہوں۔

جب ہم گاؤں میں پہنچ گئے تو گاؤں کے عین سرے پر بنے ہوئے رہٹ کے قریب جیا سنگھ نے اپنی سانڈنی بٹھا دی۔ میری سائیکل اتاری، پھر خود اترا اور مجھے بھی اتارا۔ میری گٹھڑی میرے حوالے کر دی۔

گاؤں پر اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی متنفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی۔ سب لوگ اپنے کچے مکانوں کی چھتوں پر پڑے سو رہے تھے صرف گاؤں کے دوسرے سرے سے کتوں کے بھونکنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں

اس نے چلتے ہوئے رہٹ سے پانی پیا۔ پانی کی بوندیں اس کی مونچھوں سے نیچے کی طرف ٹپک کر گرنے لگیں۔ میں نے سائیکل قریب کی ایک دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی۔ گٹھڑی بھی اسی پر رکھ دی جیا سنگھ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا میں اس سے اس قدر مانوس ہو چکا تھا جیسے ہم برسوں کے واقف ہوں۔ میں ایسے محسوس کر رہا تھا کہ آئندہ ہم زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ اس نے اپنے بے تکلفانہ لہجے میں پوچھا" کہو اب تو گھر پہنچ جاؤ گے۔ راستہ تو نہ بھولو گے۔

میں نے شرما کر کہا" جی نہیں، اب میں پہنچ جاؤں گا۔

میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سمجھ نہ سکا کہ اس جذبے کا اظہار کیونکر کروں میں اسی کشمکش ہی میں تھا۔ کہ اس نے پگڑی کے شملے سے مونچھیں اور داڑھی پونچھتے ہوئے کہا۔ اچھا اب تم گھر کو جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔"

میں نے اس کی پگڑی کے شملوں کی طرف دیکھا۔ ایک کان کے قریب لٹک رہا تھا اور دوسرا ہوا میں بلند پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بھاری ستون کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں کا ٹھ کے سے ہاتھوں میں میرا کمزور اور چھوٹا سا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا۔ اس طرح اس قدر بڑے آدمی سے ہاتھ ملانے میں مجھے فخر محسوس ہوا۔ مجھے یہ خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ وہ ایک دم واپس جانے پر تل جائے گا۔ میں نے کہا" آیئے ہمارے گھر چلیئے۔ گھر کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

یہ بات سن کر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی رکنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اس نے انگلی سے پرے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" کیا کہتے ہو۔

مجھے دیکھ کر خوش ہوں گے؟ ۔۔۔۔ ہو ہا ہا ہا "

ہنستے ہنستے اس کی ناک کی نوک سرخ ہو گئی ۔

میں نے اس کی انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لیجانے کے لیے اصرار کیا تو پھر وہ کہنے لگا "آج تک مجھے بہت ضروری کام ہے اس لئے تم جاؤ میں پھر کبھی آؤں گا تمہارا نام تو میں جانتا ہی ہوں "۔

میں نے انگلی اٹھا کر کہا ضرور"۔

"ضرور" وہ ہنسنے لگا ۔

اس کے بعد وہ اپنی کلہاڑی سنبھالتا ہوا سانڈنی پر سوار ہوا ۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ افق میں غائب ہو گیا ۔۔۔ گرد کے بادل اڑتے رہ گئے لیکن وہ پھر کبھی نہیں آیا ۔۔۔ کبھی نہیں ۔